





حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل (نے) مٹنا ہی تھا  
مسلمانوں میں فتنہ پھیلانے والے ایک نئے فرقے کی بنیاد  
کے متعلق برطانوی جاسوس

## ہمفرے کے اعترافات

عبدالوہاب نجدی کون تھا؟؟؟

عبدالوہاب نجدی کو کس نے عالم اسلام میں فتنہ برپا کرنے پر آمادہ کیا؟؟؟

ایک ایسا واقعہ جو انگریزوں کی ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے!!!

ایک ایسی تحریر جسے جھٹلانا ناممکن ہے!!!

ایک ایسا اعتراف جو حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے!!!

ایک ایسی سازش جس سے ہر مسلمان کا باخبر ہونا ضروری ہے!!!

..... ناشر .....

## جملہ حقوق محفوظ ہیں

|                             |       |          |
|-----------------------------|-------|----------|
| ہمفرے کے اعترافات           | ..... | نام کتاب |
| صاحبزادہ محمد عرفان توگیروی | ..... | تصحیح    |
| 112                         | ..... | صفحات    |
| ایم نعمان اطہر              | ..... | کمپوزنگ  |
|                             | ..... | ناشر     |
| 70/- روپے                   | ..... | قیمت     |

..... ملنے کا پتہ .....

## تمہید

## عجم ہنوز نذا ندر موز دیں ورنہ

حکم خداوندی کی تعمیل سے انکار پر..... اُسے لعنت کا طوق پہنایا گیا اور پستیوں میں دھکیل دیا گیا..... یہ ابلیس تھا جو کبھی معلم ملائکہ رہا..... لیکن اب ملعون و مردود ہے..... اس کا دعویٰ تھا کہ آدم اس سے بہتر نہیں..... لہذا کیوں اُن کی تعظیم کرے..... اس نا فرمانی پر مردور بارگاہ ٹھہرا تو قسمیں کھانے لگا:..... ”میں ضرور اولاد آدم کو گمراہ کروں گا“..... خالق کائنات نے اولاد آدم کو آگاہ کر دیا کہ اسے دوست بنائے گا..... وہ بھڑکتی ہوئی آگ کا ایندھن بنے گا..... چنانچہ ابلیس لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی خود ساختہ توحید کے ساتھ کمر بستہ ہو گیا..... کبھی نمرود کی صورت میں صف آراء ہوا تو کبھی فرعون کی شکل میں معرکہ آراء رہا..... ولادت خاتم الانبیاء ﷺ کے موقع پر چلا چلا کر ویاس..... پھر ابو جہل کا ہم نوا بن گیا اور ضرورت پڑنے پر ”شیخ نجدی“ بن کر نبی اکرم ﷺ کے خلاف منصوبہ سازی میں شریک ہوا..... مدینہ طیبہ میں عبداللہ ابن ابی کی حوصلہ افزائی کے علاوہ منافقین کا ساتھ دیتا رہا..... حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بے پناہ ڈرتا..... کیونکہ آپ توحید جبریل کے مقابلے میں توحید ابلیس کا پرچار کرنے والے منافقین کو فنا فی النار کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتے..... آخر کار جب اس لعین کو موقع ملا تو یزید بن گیا..... اور کربلا کے میدان میں گلستان نبوت پر ”الاخیر منہ“ کہتا ہوا ٹوٹ پڑا..... لیکن میرے حسین علیہ السلام..... جو مصطفیٰ کریم ﷺ کی گود میں کھیلتے رہے..... جو سردار نبوت ﷺ کے شانوں پر سوار رہے..... اور سرتاج رسالت ﷺ کی پشت مبارک پر تشریف فرما رہے..... شریعت مصطفوی کی حفاظت کے لیے جبردا آزما ہوتے..... اور یزیدیت کو خاک میں ملا دیا..... دنیا والین نے ”الحسین علی“ کے نظارے دیکھے تھے..... لیکن اب ”السامن الحسین“

کے مناظر دکھائی دیئے تو سامان فطرت حیرت کی دنیا میں گم ہو گیا.....

وقت گزرتا رہا..... مسلمان امن و سکون کے ساتھ اپنے نبی کی تعلیمات پر عمل کرتے رہے..... اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کی محبت میں سرشار اہل ایمان حاکم و غالب رہے..... عروج کے یہ سلسلے ابلیس کو بھلا کب گوارا تھے؟..... میدان کربلا میں شکست کھایا ہوا شیطان یزیدیت کے زہر میں بچھ چکا تھا..... چنانچہ ایک مرتبہ پھر ابلیس نے پینتر ابدلا اور مسلمانوں کے ایمان پر شب خون مارنے کے لیے سر اٹھانے لگا..... اہل فکر و دانش بھی ہوشیار ہو گئے..... معروف برطانوی جاسوس ”ہمفرے“ اور فرنگ و ابلیس کی قیادت میں نجد سے اٹھنے والے ایک گروہ نے حرمین شریفین پر قبضہ کیا تو انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی..... لیکن ابلیس کا مشن جاری رہا..... وقت آن پہنچا تھا کہ حکم تعظیم کی نافرمانی پر سزا ملنے کا رد عمل ظاہر کیا جائے..... چنانچہ اس نے اپنے نجدی دوستوں کے ذریعے تعظیم کے ہر اس نشان کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی..... جس کی عظمت مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد ہے..... اللہ کے برگزیدہ بندوں اور صالحین کے آثار و مقابر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ختم کیا گیا..... اپنے آباؤ اجداد کے بتوں کو بدھ مت کا ورثہ قرار دے کر چھوڑنے والوں نے پیکر ان تو حید پر حیا سوز الزامات چسپاں کیے..... اور اس ابلیسی سہارے کے ذریعے اپنا دائرہ کار پھیلاتے چلے گئے..... برصغیر میں ابلیسی توحید کے جراثیم پہنچے تو اہل نظر اضطراب میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے اپنی قوم کو ہر ممکن طریقے سے بیدار کرنے کی کوشش کی..... چنانچہ اقبالؒ نے ابلیس کے مشن کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا  
روح محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو  
فکر عرب کو دے کر فرنگی تخیلات  
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

پھر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا گیا تو ابلیس کے ماننے والے یہاں بھی سرگرم عمل رہے..... ورنہ اقبال گو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی:

عجم ہنوز نداند رموزِ دینِ ورنہ  
 ز دیوبند حسین احمد اپن چہ بواجہی است  
 سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است  
 چہ بے خرز مقام محمد ﷺ عربی است  
 بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست  
 اگر بہ اوز سیدی تمام بولہی است

(یعنی عجمی لوگ دین کی رمزیں ابھی تک نہیں سمجھ پائے ورنہ حسین احمد (دیوبندی) سے یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ برسر منبر وہ کہتا ہے: ”قومیں اوطان سے بنتی ہیں“۔ محمد عربی ﷺ کے مقام سے کتنا بے خبر ہے؟ اپنے آپ کو مصطفیٰ کریم ﷺ تک پہنچا دے کہ دین اسی چیز کا نام ہے اور اگر ان تک نہیں پہنچا تو تمام کی تمام بولہی ہے۔)

اللہ حق غالب رہے اور ابلیس کے حامی ناکام ہو گئے..... لیکن توحید جبریل پر ابلیسی توحید کا حملہ مسلسل جاری ہے..... آئیے اہم کسی کی طرف نہیں دیکھتے..... لیکن انعام والوں کی راہ ضرور مانگتے ہیں..... لہذا ان کی بیرونی اختیار کیجئے جن پر اللہ تبارک و تعالیٰ جل شانہ کا انعام ہوا ہے..... جو داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہیں..... جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے معروف ہیں..... جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہیں..... جو قبلہ عالم حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہیں..... جو فیاض عالم حضرت خواجہ غلام رسول توکیروی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہیں..... جو سماں شیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے معروف ہیں اور جو حضرت کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہیں.....

اللہ تبارک و تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اُس نے ہمیں سچے انعام والے عطاء کیے اور پھر اُن کی سنگت اختیار کرنے کا حکم بھی دیا..... لہذا حکم ماننے والے..... تعظیم کرنے والے..... اور..... اطاعت کرنے والے..... بڑے خوش قسمت ہیں کہ انعام والے بن رہے ہیں..... انہی انعام والوں میں میرے محترم پیر طریقت حاجی انعام اللہ طیبی برکاتی دامت برکاتہم العالیہ (خلیفہ مجاز حضرت کرمان والے) شامل ہیں..... جن کا شمار مرشد العصر، شیخ المشائخ باباجی سید میر طیب علی شاہ بخاری دامت برکاتہم القدسیہ کے محبین انعام یا فتگان میں ہوتا ہے..... سلسلہ تبلیغ و تربیت میں آپ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔

والسلام الی یوم القیام

ملک ثناء اللہ اعوان

ایڈیٹر ”مجلہ حضرت کرمان والا“

۱۱ محرم الحرام ۱۴۲۶ ہجری

سوموار، ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء

### حوالہ جات

- (۱) سورة الاعراف: ۱۸
- (۲) سورة الحج: ۴
- (۳) روض الانف، از علامہ ابوالقاسم سہلی، جلد اول، صفحہ ۱۸۱
- (۴) نگارشات محمد علی از مولانا محمد علی جوہر ص ۳۶، تاریخ نجد و حجاز، ص ۲۲۷
- (۵) ضرب کلیم، حکیم الامت، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، ص ۱۰۸
- (۶) ضرب کلیم، حکیم الامت، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، ص ۱۶۶
- (۷) سورة الفاتحہ: ۶-۵
- (۸) سورة توبہ: ۱۱۹

## ہمفرے نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ

مدتوں حکومت برطانیہ اپنی عظیم نوآبادیوں کے بارے میں فکر مند رہی اور اس کی سلطنت کی حدود نے اتنی وسعت اختیار کی کہ اب وہاں سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہندوستان، چین اور مشرق وسطیٰ کے ممالک اور دیگر بے شمار نوآبادیوں کے ہوتے ہوئے بھی جزیرہ برطانیہ بہت چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ حکومت برطانیہ کی سامراجی پالیسی بھی ہر ملک میں یکساں نوعیت کی نہیں ہے۔ بعض ممالک میں عمان حکومت ظاہر اوہاں کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے لیکن در پردہ پورا سامراجی نظام کار فرما ہے اور اب اس میں کوئی کسر باقی نہیں ہے کہ وہ ممالک اپنی ظاہری آزادی کھو کر برطانیہ کی گود میں چلے آئیں۔ اب ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے نوآبادیاتی نظام پر نظر ثانی کریں اور خاص طور سے دو باتوں پر لامی توجہ دیں۔

(۱) ایسی تدابیر اختیار کریں جو سلطنت کی نوآبادیوں میں اس کے عمل دخل اور قبضے کو مستحکم کریں۔

(۲) ایسے پروگرام مرتب کریں جن سے ان علاقوں پر ہمارا اثر و رسوخ قائم ہو جو ابھی ہماری نوآبادیاتی نظام کو شکار نہیں ہوئے ہیں۔

انگلستان کی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے مذکورہ پروگراموں کو روپیہ عمل لانے کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی علاقوں میں جاسوسی اور حصول اطلاعات کے لیے وفود روانہ کرے۔ میں نے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت میں ملازمت کے شروع ہی سے حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ خاص طور پر "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے امور کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں اچھی کارکردگی نے مجھے وزارت خزانہ میں ایک اچھے عہدے پر فائز کیا۔ یہ کمپنی بظاہر تجارتی نوعیت کی تھی مگر درحقیقت جاسوسی کا اڈا تھا اور اس کے نام کا مقصد ہندوستان میں ان صورتوں یا ان راستوں کی تلاش تھی جن کے ذریعے اس کے رازداروں کو برطانیہ کا اثر و نفوذ قائم ہو سکے اور مشرق وسطیٰ



پراس کی گرفت مضبوط کی جاسکے۔

ان دنوں انگلستان کی حکومت ہندوستان سے بڑی مطمئن اور بے فکر تھی کیونکہ قومی، قبائلی اور ثقافتی اختلافات مشرق وسطیٰ کے رہنے والوں کو اس بات کی فرصت ہی کہاں رہنے دیتے تھے کہ وہ انگلستان کے جائزہ اثر و رسوخ کے خلاف کوئی شورش برپا کر سکیں۔ یہی حال چین کی سرزمین کا بھی تھا۔ بدھ اور کنفیوشس جیسے مردہ مذاہب کے پیروکاروں کی طرف سے بھی انگریزوں کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا اور ہندو چین میں کثرت سے باہمی اختلافات کے پیش نظر یہ بات بعید از قیاس تھی کہ وہاں کے رہنے والوں کو اپنی آزادی اور استقلال کی فکر ہو۔ یہی وہ ایک موضوع تھا جو کبھی ان کے لیے قابل توجہ نہیں رہا۔ تاہم یہ سوچنا بھی غیر دانشمندی ہے کہ آئندہ کے پیش نظر انقلابات بھی ان قوموں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کریں گے۔ پس یہ بات سامنے آئی کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان قوموں میں بیداری کی صلاحیت مفقود ہو جائے۔ یہ تدابیر طویل المیعاد پروگراموں کی صورت میں ان سرزمینوں پر جاری ہوئے جو تمام کے تمام افتراق، جہالت، بیماری اور غربت کی بنیاد پر استوار تھے۔ ہم سے ان علاقوں کے لوگوں پر ان مصیبتوں اور بد بختیوں کو وارد کرتے ہوئے بدھ مت کی اس ضرب المثل کو اپنایا جس میں کہا گیا ہے۔

”بیمار کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور پھر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو

بالا خروہ دو اپوری کڑواہٹ کے باوجود پسند کرنے لگے گا۔“

ہم نے باوجود اس کے کہ اپنے دوسرے بیمار یعنی سلطنت عثمانی سے کئی قراردادوں پر اپنے فائدہ میں دستخط کر والیے تھے تاہم نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے ماہرین کا کہنا تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اس سلطنت کا پلہ بیٹھ سکتا ہے۔ ہم نے اسی طرح ایران کے زیر اثر سرگرم عمل رہے اور باوجود اس کے نظام کو ہکا بکا کر رشوت ستانی عام کر دی، بادشاہوں کے لیے عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے اور اس طرح ان حکومتوں کی جہازوں

کو کسی حد تک پہلے سے زیادہ متزلزل کیا تاہم عثمانی اور ایرانی سلطنتوں کی کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے بھی ذیل میں بیان کی جانے والی بعض وجوہات کی بناء پر ہم اپنے حق میں کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے اور وہ اہم ترین وجوہات یہ تھیں۔

(۱) لوگوں میں اسلام کی حقیقی روح کا اثر و نفوذ جس نے انہیں بہادر، بے باک اور پر عزم بنا دیا تھا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک عام مسلمان، مذہبی بنیادوں پر ایک پادری کا ہم پلہ تھا۔ یہ لوگ کسی صورت میں بھی اپنے مذہب سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں شیعہ مذہب کے پیرہ کارجن کا تعلق ایران کی سر زمین سے ہے، عقیدے اور ایمان کے اعتبار سے زیادہ مستحکم اور زیادہ خطرناک واقع ہوئے ہیں۔

شیعہ حضرات عیسائیوں کو نجس اور کافر مطلق سمجھتے ہیں ان کے نزدیک ایک عیسائی ایسی متعفن غلاظت کی حیثیت رکھتا ہے جسے اپنے درمیان سے ہٹانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ ایک دفعہ میں نے ایک شیعہ سے پوچھا:

”تم لوگ نصاریٰ کو حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہو حالانکہ وہ

لوگ خدا، رسول اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں؟“

اس نے جواب دیا: ”حضرت محمد ﷺ صاحب علم اور صاحب حکمت پیغمبر تھے

اور وہ چاہتے تھے کہ اس انداز سے کافروں پر دباؤ ڈالیں کہ وہ دین اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔“

سیاسی میدان میں بھی جب کبھی حکومتوں کو کسی فرد یا گروہ سے کھٹکا ہوتا ہے تو وہ

اپنی عزت پر سختیاں کرتی ہیں اور اسے راستے سے ہٹنے پر مجبور کرتی ہیں تاکہ بالآخر وہ اپنی

حکومتوں سے باز آجائے اور اپنا سر تسلیم خم کر دے۔ عیسائیوں کے نجس اور ناپاک ہونے

کے سبب انہیں ہٹا دیا گیا اور انہیں ہٹا دیا گیا۔ اور یہ بات صرف عیسائیوں ہی تک



محدود نہیں ہے بلکہ اس میں زرد تشتی بھی شامل ہیں جو قومی اعتبار سے ایرانی ہیں، اسلام انہیں بھی ”ناپاک“ سمجھتا ہے۔

میں نے کہا: ”اچھا! مگر عیسائی تو خدا، رسول اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس نے جواب دیا:

”ہمارے پاس انہیں کافر اور نجس گرداننے کے لیے دو دلیلیں ہیں پہلی دلیل تو یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ جھوٹے ہیں۔ ہم بھی ان کے جواب کہتے ہیں کہ تم لوگ ناپاک اور نجس ہو اور یہ تعلق عقل کی بنیاد پر ہے“ کیونکہ ”جو تمہیں دکھ پہنچائے تم بھی اسے تکلیف دو“۔

دوسرے یہ کہ عیسائی انبیاء و مرسلین پر جھوٹی تہمتیں باندھتے ہیں جو خود ایک بڑا گناہ اور ان کی بے حرمتی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں:

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام (نعوذ باللہ) شراب پیتے تھے، اس لیے لعنت الہی میں گرفتار ہوئے اور انہیں سولی دی گئی“۔

مجھے اس بات پر بڑا ناؤ آیا اور میں نے کہا:

”عیسائی ہرگز ایسا نہیں کہتے“

اس نے کہا:

تم نہیں جانتے ”کتاب مقدس“ میں یہ تمام تہمتیں وارد ہیں۔

اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا اور مجھے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگرچہ میں نے سنا تھا کہ بعض افراد نے پیغمبر اسلام پر جھوٹ کی نسبت کی ہے لیکن میں اس سے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں میرا بھانڈا نہ پھوٹ جائے اور لوگ میری اصلیت سے واقف نہ ہو جائیں۔

(۲) مذہب اسلام تاریخی پس منظروں کی بنیاد پر ایک حریت پسند مذہب ہے اور اسلام کے سچے پیروکار آسانی کے ساتھ غلامی قبول نہیں کرتے۔ ان کے پورے وجود میں

گزشتہ عظیموں کا غرور سمایا ہوا ہے یہاں تک کہ اپنے اس ناتوانی اور پرفور دور میں بھی وہ اس سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہیں۔ ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ تاریخ اسلام کی من مانی تفسیر پیش کر کے انہیں یہ بتائیں کہ تمہاری گزشتہ عظیموں کی کامیابی ان حالات پر منحصر تھی جو اس زمانے کا تقاضا تھا مگر اب زمانہ بدل چکا ہے اور نئے تقاضوں نے ان کی جگہ لے لی ہے اور اب گزشتہ دور میں واپسی ناممکن ہے۔

(۳) ہم ایرانی اور عثمانی حکومتوں کی دور اندیشیوں ہوشیاریوں اور کاروائیوں سے محفوظ نہیں تھے اور ہر آن یہ کھٹکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ہماری سامراجی پالیسی سے باخبر ہو کر ہمارے کیے دھرے پر پانی نہ پھیر دیں۔ یہ دونوں حکومتیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بہت کمزور ہو چکی تھیں اور ان کا اثر و رسوخ صرف اپنی سر زمین کی حد تک محدود تھا۔ وہ صرف اپنے ہی علاقے میں ہمارے خلاف اسلحہ اور پیسہ جمع کر سکتے تھے تاہم ان کی بدگمانی ہماری آئندہ کامیابیوں کے لیے عدم اطمینان کا سبب تھی۔

(۴) مسلمان علماء بھی ہماری تشویش کا باعث تھے۔ جامعہ الازہر کے مفتی اور ایران و عراق کے شیعہ مراجع ہمارے سامراجی مقاصد کی راہ میں ایک عظیم رکاوٹ تھے۔ یہ علماء جدید علم و تمدن اور نئے حالات سے یکسر بے خبر تھے اور ان کی تنہا توجہ اس جنت کے لیے تھی جس کا وعدہ قرآن نے انہیں دے رکھا تھا۔ یہ لوگ اس قدر متعصب تھے کہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ بادشاہ اور امراء سمیت تمام افراد ان کے آگے چھوٹے تھے۔ اہل سنت حضرات شیعوں کی نسبت اپنے علماء سے اس قدر خوفزدہ نہیں تھی اور ہم دیکھتے ہیں کہ عثمانی سلطنت میں بادشاہ اور شیخ الاسلام کے درمیان ہمیشہ خوشگوار تعلقات برقرار رہے تھے اور علماء کا احترام کرتے تھے۔ مذہبی علماء سے ان کا لگاؤ ایک حقیقی لگاؤ تھا لیکن حکام یا سلاطین کو وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بہر حال سلاطین اور علماء کی قدر دانی سے متعلق حدیث اور سنن انبیاء کا یہ فرق نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت اور انگریزی حکومت کی



ہم نے کئی بار ان ممالک کے ساتھ آپس کی پوچھیدہ دشواریوں کو دور کرنے کے سلسلے میں گفتگو کی لیکن ہمیشہ ہماری گفتگو نے بدگمانی کی صورت اختیار کی اور ہم نے اپنا راستہ بند پایا۔ ہمارے جاسوسوں اور سیاسی کارکنوں کی درخواستیں بھی سابقہ مذاکرات کی طرح بری طرح ناکام رہیں لیکن پھر بھی ہم ناامید نہیں ہوئے کیونکہ ہم ایک مضبوط اور بر شکیب قلب کے مالک ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ نوآبادیاتی علاقوں کے وزیر نے لندن کے ایک مشہور پادری اور ۲۵ دیگر مذہبی سربراہوں کے ساتھ ایک اجلاس منعقد کیا جو پورے تین گھنٹے تک جاری رہا اور جب یہاں بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تو پادری نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا:

”آپ لوگ اپنی ہمتیں پست نہ کریں، صبر اور حوصلہ سے کام لیں، عیسائیت تین سو سال کی زحمتوں اور در بدری کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کی شہادت کے بعد عالمگیر ہوئی، ممکن ہے آئندہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نظر عنایت ہم پر ہو اور ہم تین سو سال بعد کافروں کو نکالنے میں کامیاب ہوں۔ پس ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے آپ کو محکم ایمان اور پائیدار صبر سے مزین کریں اور ان تمام وسائل کو بروئے کار لائیں جو مسلمان خطوں میں عیسائیت کی ترویج کا سبب ہوں۔ اور اس میں ہمیں صدیوں کا عرصہ بھی گزر جائے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آباؤ اجداد اپنی اولاد کے لیے بیج بوتے ہیں۔“

ایک دفعہ پھر نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت میں روس، فرانس اور برطانیہ کے اعلیٰ نمائندوں پر مبنی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ کانفرنس کے شرکاء میں سیاسی وفود، مذہبی شخصیتیں اور دیگر مشہور ہستیاں شامل تھیں۔ حسن اتفاق سے میں بھی وزیر سے قریبی تعلقات کی بنا پر اس کانفرنس میں شریک تھا۔ موضوع گفتگو اسلامی ممالک میں سامراجی نظام کی ترویج اور اس میں پیش آنے والی دشواریاں تھا۔

شركاء كا غور و فكر اس بات ميں تھا كه هم كس طرح مسلم طاقتوں كو درهم برهم كر سكتے هيں اور ان كے درميان نفاق كا بچ هو سكتے هيں۔ گفتگو ان كے ايمان كے تزلزل كے سلسلے ميں تھی۔ بعض لوگوں كا خيال تھا كه مسلمانوں كو اسی طرح راه راست پر لایا جا سكتا ہے جس طرح اسپين كئی صدیوں كے بعد عيسائيوں كی آغوش ميں چلا آيا تھا۔ كيا يہ وہی ملك نہيں تھا جسے وحشی مسلمانوں نے فتح كيا تھا؟ كانفرنس كے نتائج زياده واضح نہيں تھے۔ ميں نے اس كانفرنس ميں پيش آنے والے تمام واقعات كو اپنی كتاب ”عظيم مسيح كی سمت ايك پرواز“ ميں بيان كر ديا ہے۔

حقيقتاً مشرق سے مغرب تك پھيلاؤ ركھنے والے عظيم اور تناور درخت كی جڑوں كو كاٹنا اتنا آسان كام نہيں۔ پھر بھی ہمیں ہر قيمت پر ان دشواریوں كا مقابلہ كرنا ہے كيونكه عيسائى مذہب اسی وقت كامياب هو سكتا ہے جب ساری دنيا اس كے قبضہ ميں آجائے۔ حضرت عيسى عليه السلام نے اپنے سچے پيروكاروں كو اس جہانگيری كی بشارت دی ہے۔ حضرت محمد ﷺ كی كاميابی ان اجتماعى اور تاريخى حالات سے وابستہ تھی جو اس دور كا تقاضا تھا۔ ايران و روم سے وابستہ مشرق و مغرب كی سلطنتوں كا انحطاط دراصل بہت كم عرصے ميں حضرت محمد ﷺ كی كاميابی كا سبب بنا۔ مسلمانوں نے ان عظيم سلطنتوں كو زير كيا، مگر اب حالات بالكل مختلف ہو چكے هيں اور اسلامى ممالك بوى تيزی سے رو بہ زوال هيں اور اس كے مقابلے ميں عيسائى روز بروز ترقى كی راہ پر گامزن هيں۔ اب وہ وقت آگيا ہے كه عيسائى مسلمانوں سے اپنا بدلہ چكائیں اور اپنی كھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل كريں۔ اس وقت سب سے بڑی عيسائى حكومت عظيم بيلانوں كے ہاتھ ميں ہے جو دنيا كے طول و عرض ميں اپنا سكه جمائے ہوئے ہے اور اب چاہتا ہے كه اسلامى مملكتوں سے فبردا زماں كا پرچم بھی اسی كے ہاتھ ميں هو۔

بيلانوں كے ہاتھ ميں انگلستان كی نوآبادياتى علاقوں كی وزارت نے مجھے مصر، عراق، ايران، عمان، عمان، عمان، عمان (آج كا اقبول اس وقت كا سلطان تھا) كی جاسوسى پر



مامور کیا۔ مجھے ان علاقوں میں وہ راہیں تلاش کرنی تھیں جن سے مسلمانوں کو درہم برہم کر کے مسلم ممالک میں سامراجی نظام رائج کیا جاسکے۔ میرے ساتھ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے نو اور بہترین تجربہ کار جاسوس اسلامی ممالک میں اس کام پر مامور تھے اور بڑی تندہی سے انگریز سامراجی نظام کے تسلط اور نوآبادیاتی علاقوں میں اپنے اثر نفوذ کے استحکام کے لیے سرگرم عمل تھی۔ ان فنود کو وافر مقدار میں سرمایہ فراہم کیا گیا تھا۔ یہ لوگ بڑے مرتب شدہ نقشے اور بالکل نئی اور تازہ اطلاعات سے بہرہ مند تھے۔ ان کو امراء، وزراء، حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور علماء و رؤسا کے ناموں کی مکمل فہرست دی گئی تھی۔ نوآبادیاتی علاقوں کے معاون وزیر نے ہمیں روانہ کرتے ہوئے خدا حافظی کے وقت جو بات کہی، وہ آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے کہا تھا:

”تمہاری کامیابی ہمارے ملک کے مستقبل کی آئینہ دار ہوگی لہذا اپنی تمام قوتوں

کو بروئے کار لاؤ تاکہ کامیابی تمہارے قدم چومے۔“

میں خوشی خوشی بحری جہاز کے ذریعے استنبول کے لیے روانہ ہوا۔ میرے ذمے اب دو اہم کام تھے۔ پہلے ترکی زبان پر عبور حاصل کرنا جو ان دنوں وہاں کی قومی زبان تھی۔ میں نے لندن میں ترکی زبان کے چند الفاظ سیکھ لیے تھے۔ اس کے بعد مجھے عربی زبان، قرآن، اس کی تفسیر اور پھر فارسی سیکھنا تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کسی زبان کو سیکھنا اور ادبی قواعد، فصاحت اور مہارت کے اعتبار سے اس پر پوری دسترس رکھنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ میں ان زبانوں میں ایسی مہارت حاصل کروں کہ مجھ میں اور وہاں کے لوگوں میں زبان کے اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ کسی زبان کو ایک دو سال میں دیکھا جاتا ہے لیکن اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے برسوں کا وقت درکار ہوتا ہے۔ میں اس بات پر مجبور تھا کہ ان غیر ملکی زبانوں کو اس طرح سیکھوں کہ اس کے قواعد و رموز کا کوئی نقطہ فرو گذاشت نہ ہو اور کوئی میرے ترک، ایرانی یا عرب ہونے پر شک نہ کرے۔

ان تمام مشکلات کے باوجود میں اپنی کامیابی کے سلسلے میں ہراساں نہیں تھا کیونکہ میں مسلمانوں کی طبیعت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ان کی کشادہ قلبی، حسن ظن اور مہمان نواز طبیعت جو انہیں قرآن و سنت سے ورثے میں ملی تھی انہیں عیسائیوں کی طرح بدگمانی اور بد بینی پر محمول نہیں کرے گی اور پھر دوسری طرف سے عثمانی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اب اس کے پاس انگلستان اور غیر ملکی جاسوسوں کی کاروائیاں معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا جو حکومت کو ان نامطلوب عناصر سے باخبر رکھ سکے۔ فرمانروا اور اس کے مصاحبین پورے طور پر کمزور ہو چکے تھے۔

کئی مہینے کے تھا کہ دینے والی سفر کے بعد آخر کار ہم عثمانی دار الخلافہ میں پہنچے۔ جہاز سے اترنے سے پہلے میں نے اپنے لیے ”محمد“ کا نام تجویز کیا اور جب میں شہر کی جامع مسجد میں داخل ہوا تو وہاں لوگوں کے اجتماعات، نظم و ضبط اور صفائی ستھرائی دیکھ کر خوش ہوا اور دل ہی دل میں کہا: آخر کیوں ہم ان پاک دل افراد کے آزار کے درپے ہیں؟ اور کیوں ان سے ان کی آسائش چھیننے پر تلے ہوئے ہیں؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس قسم کے ناشائستہ امور کی تجویز دی تھی؟ لیکن فوراً ہی میں نے اس شیطانی وسوسوں اور باطل خیالات کو ذہن سے جھٹک کر استغفار کیا اور مجھے خیال آیا کہ میں تو برطانیہ عظمیٰ کی نوآبادیاتی وزارت کا ملازم ہوں اور مجھے اپنی فرائض دیانتداری سے انجام دینے چاہئیں اور منہ سے لگائے ہوئے سافرا کو آخری گھونٹ تک پی جانا ہے۔

شہر میں داخلہ کے فوراً بعد ہی میری ملاقات اہل تسکین کی ایک بوڑھے پیشوا سے ہوئی۔ ان کا نام احمد آفریدی تھا وہ ایک برجستہ، صاحب فضل اور نیک طبیعت عالم تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں ایسی بزرگ ہستی نہیں دیکھی تھی۔ وہ دن رات عبادت میں مشغول رہتا تھا اور اپنی اولاد بزرگی میں حضرت محمد ﷺ کی مانند تھا۔ وہ رسول خدا کو انسانیت کا مظہر



کا نام آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ شیخ کے ساتھ ملاقات میں میری ایک خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ اس نے مجھ سے ایک دفعہ بھی میرے حسب نسب اور خاندان کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا اور ہمیشہ مجھے محمد آفندی کے نام سے پکارتا تھا۔ جو کچھ بھی میں اس سے پوچھتا تھا، بڑے وقار اور شرافت سے جواب دیتا تھا اور مجھے بہت چاہتا تھا۔ خاص طور پر جب اسے معلوم ہوا کہ میں غریب الوطن ہوں اور اس عثمانی سلطنت کے لیے کار کر رہا ہوں جو پیغمبر کی جانشین ہے تو مجھ پر اور بھی مہربان ہو گیا (یہ جھوٹ تھا جو میں نے استنبول میں اپنے قیام کی توجیہ بیان کرتے ہوئے شیخ کے سامنے بولا تھا)

اس کے علاوہ میں نے شیخ سے یہ بھی کہا تھا کہ میں بن ماں باپ کا ایک نوجوان ہوں، میرے بہن بھائی نہیں ہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں لیکن میرے والدین نے ورثہ میں میرے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ قرآن اور ترکی اور عربی زبان سیکھنے کے لیے اسلام کے مرکز یعنی استنبول کا سفر اختیار کروں اور پھر دینی اور معنوی سرمایہ کے حصول کے بعد مادی کاروبار میں پیسہ لگاؤں۔ شیخ احمد نے مجھے مبارکباد دی اور چند باتیں کہیں جنہیں میں اپنی نوٹ بک سے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

اے نوجوان! مجھ پر تمہاری پذیرائی اور احترام کئی وجوہات کی بنا پر لازم ہے اور وہ

وجوہات یہ ہیں:

(۱) تم ایک مسلمان ہو اور مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ)

(۲) تم ہمارے شہر میں مہمان ہو اور پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے: (اَكْسَرُكُمْ مَوَالِي الضَّيْفِ)

مہمان کو محترم جانو۔

(۳) تم طالب علم ہو اور اسلام نے طالب علم کے احترام کا حکم دیا ہے تم حلال روزی

کمانا چاہتے ہو اور اس پر (أَلَيْسَ بِسَبِّ حَبِيبِ اللَّهِ) کاروبار کرنے والا اللہ کا

دوست ہے کی حدیث صادق آتی ہے۔

اس پہلی ملاقات ہی میں شیخ نے اعلیٰ خصائل کی بنیاد پر مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا: کاش! عیسائیت بھی ان آشکار حقیقتوں سے آشنا ہوتی لیکن دوسری طرف میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اسلامی شریعت اتنی بلند نگاہی اور بلند مقامی کے باوجود رو بہ زوال ہو رہی تھی اور اسلامی حکمرانوں کی نالائقی، ظلم و ستم، بد اطواری اور پھر علمائے دین کا تعصب اور دنیا کے حالات سے انکی بے خبری انہیں یہ دن دکھا رہی تھی۔ میں نے شیخ سے کہا:

”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ سے عربی زبان اور قرآن مجید سیکھنے کا خواہش مند ہوں۔“

شیخ نے میری ہمت افزائی کی اور میری خواہش کا استقبال کیا اور سورہ حمد کو میرے لیے پہلا سبق قرار دیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ آیتوں کی تفسیر و تاویل پیش کی۔ میرے لیے بہت سے عربی الفاظ کے تلفظ دشوار تھے اور کبھی یہ دشواری بہت بڑھ جاتی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کہتا تھا میں عربی عبارت اس طرح تمہیں نہیں سکھاؤں گا تمہیں ہر مشکل لفظ کو دس مرتبہ تکرار کرنا ہوگا تاکہ الفاظ تمہارے ذہن نشین ہو جائیں۔

شیخ نے مجھے حروف کو ایک دوسرے سے ملانے کے طریقے سکھائے۔ مجھے قرآن کی تجوید و تفسیر سیکھنے میں دو سال کا عرصہ لگا۔ درس شروع کرنے سے پہلے وہ خود بھی وضو کرتا تھا اور مجھے بھی وضو کرنے کا حکم دیتا تھا۔ پھر ہم قبلہ رخ بیٹھ جاتے تھے اور درس کا آغاز ہوتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام میں اعضاء کو ایک خاص ترتیب سے دھونے کا نام وضو ہے۔ ابتداء میں منہ دھویا جاتا ہے۔ پھر پہلے سیدھے ہاتھ کو انگلیوں اور پھر پچھلے ہاتھ سے کہنی تک دھویا جاتا ہے۔ اس کے بعد سر، گردن اور کانوں کے پچھلے حصہ کی کیا جاتا ہے اور آخر میں پھر دھوئے جاتے ہیں۔

پھر اس وقت تک کہ پانی چڑھانا مستحب ہے۔ آداب وضو کی ایک ایک بات کو یاد کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا مستحب ہے۔ آداب وضو کی

اور میں سمجھتا تھا کہ یہ خشک لکڑی دانٹوں اور مسوڑھوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ کبھی کبھی میرے مسوڑھوں سے خون بھی جاری ہو جاتا تھا مگر میں ایسا کرنے پر مجبور تھا کیونکہ وضو سے پہلے مسواک کرنا سنت مؤکدہ بیان کیا گیا تھا اور اس کے لیے بہت ثواب اور فضیلت بیان کی گئی تھی۔

میں استنبول میں قیام کے دوران راتوں کو ایک مسجد میں سو رہتا تھا اور اس کے عوض وہاں کے خادم کو جس کا نام مروان آفندی تھا کچھ رقم دے دیتا تھا۔ وہ ایک بد اخلاق، غصہ ور شخص تھا اور اپنے آپ کو پیغمبر اسلام کے ایک صحابی کا ہم نام سمجھتا تھا اور اس نام پر بڑا فخر کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا:

”اگر کبھی خدا نے تمہیں صاحب اولاد کیا تو تم اپنی بیٹی کا نام مروان رکھنا کیونکہ اس کا شمار اسلام کے عظیم مجاہدوں میں ہوتا ہے۔“

رات کا کھانا میں خادم کے ساتھ کھاتا تھا اور جمعہ کا تمام دن جو مسلمانوں کی عید اور چھٹی کا دن تھا خادم کے ساتھ گزارتا تھا۔ ہفتہ کے باقی دن ایک بڑھی کی شاگردی میں کام کرتا تھا اور وہاں سے مجھے ایک حقیر سی رقم مل جایا کرتی تھی۔ اس بڑھی کا نام خالد تھا۔ دوپہر کو کھانے کے وقت وہ ہمیشہ فاتح اسلام ”خالد بن ولید“ کا تذکرہ کرتا تھا اور اس کے فضائل بیان کرتا تھا اور اسے اصحاب پیغمبر میں گردانتا تھا جن کے ہاتھوں مخالفین اسلام نے ہزیمت اٹھائی۔ ہر چند حضرت عمر سے اس کے تعلقات کچھ زیادہ استوار نہ تھے اور اسے یہ کھٹکا تھا کہ اگر خلافت انہیں ملی تو وہ اسے معزول کر دیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

لیکن خالد بڑھی اچھے کردار کا حامل نہ تھا تاہم اپنی دیگر شاگردوں سے کچھ زیادہ ہی مجھ پر مہربان تھا جس کا سبب مجھے اب تک معلوم نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ میں بغیر لیل و نعل کے اس کے ہر کام کو بجالاتا تھا اور اس سے مذہبی امور یا اپنے کام کے بارے میں کسی قسم کا کوئی بحث و مباحثہ نہیں کرتا تھا۔ کئی بار دکان خالی ہونے پر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اچھی



نظروں سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ شیخ احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ بد فعلی اسلام میں بہت بڑا گناہ ہے لیکن پھر بھی خالد اس فعل کے ارتکاب پر مصر تھا۔

وہ دین و دیانت کا زیادہ پابند نہیں تھا اور درحقیقت صحیح عقیدہ اور صحیح ایمان کا آدمی نہیں تھا۔ وہ صرف جمعہ کے جمعہ نماز پڑھنے جایا کرتا تھا اور باقی دنوں میں اس کا نماز پڑھنا مجھ پر ثابت نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اس بے سرمانہ ترغیب کو رد کیا لیکن کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ فعل اپنی دوکان کے ایک دوسرے کاریگر کے ساتھ انجام دیا جو ابھی نو مسلم تھا اور یہودیت سے اسلام میں وارد ہوا تھا۔

میں روزانہ بڑھئی کی دکان میں دوپہر کا کھانا کھا کر نماز کے لیے مسجد میں چلا جایا کرتا تھا اور وہاں نماز عصر تک رہتا تھا۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر شیخ احمد کے گھر جایا کرتا تھا۔ اور وہاں دو گھنٹے قرآن خوانی میں صرف کرتا تھا۔ قرآن کے علاوہ عربی اور ترکی زبان بھی سیکھتا تھا۔ اور ہر جمعہ کو ہفتہ بھر کی دھاڑی زکوٰۃ کے عنوان سے شیخ احمد کے حوالے کرتا تھا اور یہ زکوٰۃ درحقیقت شیخ سے میری ارادت اور لگاؤ کا ایک نذرانہ اور شیخ کے درس قرآن کا ایک حقیر سا حق الذمہ تھا۔ قرآن کی تعلیم میں شیخ کا طرز درس بے نظیر نوعیت کا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مجھے اسلامی احکام کی مبادیات عربی اور ترکی زبان میں سکھاتا تھا۔

جب شیخ احمد کو معلوم ہوا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں تو اس نے مجھے شادی کا مشورہ دیا اور اپنی ایک بیٹی میرے لیے منتخب کی لیکن میں نے بڑے مؤدبانہ انداز سے معذرت چاہی اور اپنے آپ کو شادی کے لیے نا قابل ظاہر کیا۔ میں یہ موقف اختیار کرنے پر مجبور تھا کیونکہ شیخ احمد اپنی بات پر مصر تھا اور ہمارے تعلقات بگڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ شیخ احمد شادی کو بغیر اسلام کی سنت سمجھتا تھا اور اس حدیث کا حوالہ دیتا تھا۔

”جو کوئی میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے“

(عن رجب عن شعی فلین منی)

لہذا اس بہانہ کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے اس مصلحت آمیز جھوٹ نے شیخ کو مطمئن کر دیا اور پھر اس نے شادی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی اور ہماری دوستی پھر پہلی منزل پر آ گئی۔ دو سال استنبول میں رہنے اور قرآن سمیت عربی اور ترکی زبانوں کو سیکھنے کے بعد میں نے شیخ سے واپس وطن جانے کی اجازت چاہی لیکن شیخ مجھے اجازت نہیں دیتا تھا اور کہتا تھا تم اتنی جلدی کیوں واپس جانا چاہتے ہو؟ یہ ایک بڑا شہر ہے۔ یہاں تمہاری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ برینائے مشیت الہی استنبول میں دین اور دنیا دونوں دستیاب ہیں۔ شیخ نے اپنی گفتگو کے دوران کہا:

”اب جبکہ تم اکیلے ہو اور تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی کوئی نہیں تو پھر تم استنبول کو اپنا مسکن کیوں نہیں بناتے؟“

بہر حال شیخ کو میرے وہاں رہنے پر بڑا اصرار تھا۔ اسے مجھ سے انس ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اس سے بہت دلچسپی تھی مگر اپنے وطن انگلستان کے بارے میں مجھ پر جو ذمہ داریاں عائد تھیں وہ میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھیں اور مجھے لندن جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ میرے لیے ضرور تھا کہ میں لندن جا کر نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو اپنی دو سالہ کارگزاری کی مکمل رپورٹ پیش کروں اور وہاں سے نئے احکامات حاصل کروں۔ استنبول میں دو سال کی رہائش کے دوران مجھے عثمانی حکومت کے حالات پر ہر ماہ ایک رپورٹ لندن بھیجنی پڑتی تھی۔ میں نے اپنی ایک رپورٹ میں بدکردار بڑھئی کے اس واقعے کو بھی لکھا تھا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے مجھے یہ حکم دیا، اگر تمہارے ساتھ بڑھئی کا یہ فعل ہمارے لیے منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ کو آسان بنانا ہے تو اس کام میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے جب یہ عبارت پڑھی تو میرا سر چکرانے لگا اور میں نے سوچا ہمارے افسران کو شرم نہیں آتی کہ وہ حکومت کی مصلحتوں کی خاطر مجھے اس بے شرمی کی ترغیب دیتے ہیں۔ بہر حال میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اور ہونٹوں سے لگائے ہوئے

اس کڑوے جام کو آخری گھونٹ تک پی جانا تھا۔ تاہم میں نے اس حکم کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور لندن کے اعلیٰ عہدیداروں کی اس بے مہری کی کسی سے شکایت نہیں کی۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے شیخ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے مجھے ان الفاظ کے ساتھ رخصت کیا۔

”خدا حافظ بیٹے! مجھے معلوم ہے اب جب تم لوٹ کر آؤ گے تو مجھے اس دنیا میں نہیں

پاؤ گے مجھے نہ بھلانا۔ انشاء اللہ روز محشر پیغمبر اسلام کے حضور ہم ایک دوسرے سے ملیں گے۔“

درحقیقت شیخ احمد کی جدائی سے میں ایک عرصہ تک آزر وہ خاطر رہا اور اس کے غم

میں میری آنکھیں آنسو بہاتی رہیں لیکن کیا کیا جاسکتا تھا؟ فرائض کی انجام دہی ذاتی

احساسات سے ماورا ہے۔

میرے دیگر ساتھیوں کو بھی لندن واپس بلا لیا گیا تھا مگر بد قسمتی سے ان میں سے

صرف پانچ واپس لوٹے باقی ماندہ چار افراد میں سے ایک مسلمان ہو چکا تھا اور وہیں مصر میں

رہائش پذیر تھا۔ اس واقعہ کا نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری نے مجھے بتایا لیکن وہ

اس بات سے خوش تھا کہ مذکورہ شخص نے ان کے کسی راز کو افشاء نہیں کیا تھا۔ دوسرا جاسوس

روسی نثر اد تھا اور روس پہنچ کر اس نے وہیں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ سیکرٹری اس کے بارے

میں بڑا فکر مند تھا۔ اسے کھٹکا تھا کہ کہیں یہ روسی نثر اد جاسوس جو اب اپنی سر زمین میں پہنچ چکا

تھا ہمارے راز فاش نہ کر دے۔ تیسرا شخص بغداد کے قریب واقع ”عمارہ“ میں ہیضہ سے

ہلاک ہو گیا تھا اور چوتھے کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہ ہو سکتی تھی۔ نوآبادیاتی

علاقوں کی وزارت کو اس کے بارے میں اس وقت تک اطلاع رہی جب تک وہ یمن کے

پایہ تخت ”صنعا“ میں رہتے ہوئے مسلسل ایک سال تک اپنی رپورٹیں مذکورہ وزارت کو بھیجتا

رہا لیکن اس کے بعد جب کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تو ہر چند کوشش کے باوجود نوآبادیاتی

علاقوں کی وزارت کو اس جاسوس کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ حکومت ایک زبردست جاسوس کی

گمشدگی کے واقعے سے اس طرح باخبر تھی۔ وہ ہر ملازم کے کام کی اہمیت کو بڑی باریکی کے



ساتھ جانچتی تھی اور درحقیقت اس طرح کے ملازمین میں سے کسی ملازم کی گمشدگی کی اس سامراجی حکومت کے لیے تشویشناک تھی جو اسلامی ممالک میں غدر مچانے اور انہیں زیر کرنے کی اسکیموں کی تیاری میں مصروف ہو۔

ہمارا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جو آبادی کے اعتبار سے کم ہونے کے ساتھ بڑی اہم ذمہ داریوں کا بوجھ سہار رہی ہے اور تجربہ کار افراد کی کمی یقیناً ہمارے لیے شدید نقصان کا باعث تھی۔

سیکرٹری نے میرے آخری رپورٹ کے اہم حصوں کے مطالعہ کے بعد مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی ہدایت کی جس میں لندن بلائے گئے پانچ جاسوسوں کی رپورٹیں سنی جانے والی تھیں۔ اس کانفرنس میں جو وزیر خارجہ کی صدارت میں ہو رہی تھی نوآبادیاتی وزارت کے اعلیٰ عہدہ دار شرکت کر رہے تھے۔ میرے تمام ساتھیوں نے اپنی رپورٹوں کے اہم حصوں کو پڑھ کر سنایا۔ وزیر خزانہ، نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری اور بعض حاضرین نے میری رپورٹ کو بڑا سراہا۔ تاہم میں اس محاسبہ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ دو اور جاسوسوں نے مجھ سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا جن میں پہلا جی بلکوڈ (G. BELCOUD) اور دوسرا ہنری فانس (HENRY FANSE) تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے ترکی، عربی، تجوید قرآن اور اسلامی شریعت میں سب سے زیادہ دسترس حاصل کی تھی لیکن عثمانی حکومت کے زوال کے سلسلے میں میری رپورٹ زیادہ کامیاب نہیں تھی۔ جب سیکرٹری نے کانفرنس کے اختتام پر میری اس کمزوری کا ذکر کیا تو میں نے کہا:

ان دو سالوں میں میرے لیے دو زبانوں کا سیکھنا، تفسیر قرآن اور اسلامی شریعت سے آشنائی زیادہ اہمیت کی حامل تھی اور دوسرے امور پر توجہ دینے کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اگر آپ بھروسہ کریں تو میں یہ سیکھنا سیکھنا پوری

کر دوں گا۔ سیکرٹری نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم اپنے کام میں کامیاب رہے ہو لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم اس راہ میں دوسروں سے بازی لے جاؤ۔ آئندہ کے لیے تمہیں دو اہم باتوں کا خیال رکھنا ہے:

(۱) مسلمانوں کی ان کمزوریوں کی نشاندہی کرو جو ہمیں ان تک پہنچنے اور ان کے مختلف گروہوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کامیابی فراہم کرے کیونکہ دشمن پر ہماری کامیابی کا راز ان مسائل کی شناخت پر منحصر ہے۔

(۲) ان کی کمزوریاں جان لینے کے بعد تمہارا دوسرا کام ان میں پھوٹ ڈالنا ہے۔ اس کام میں پوری قوت صرف کرنے کے بعد تمہیں یہ اطمینان ہو جانا چاہیے کہ تمہارا شمار صف اول کے انگریز جاسوسوں میں ہونے لگا ہے اور تم اعزازی نشان کے حقدار ہو گئے ہو۔ چھ ماں لندن میں قیام کے بعد میں نے اپنے چچا کی بیٹی ”میری شوری“ سے شادی کر لی جو مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ اس وقت میں ۲۲ اور وہ ۲۳ سال کی تھی۔ ”میری ایک درمیانہ درجے کی ذہین لڑکی تھی لیکن بڑے دلکش خدو خال کی مالک تھی۔ میری بیوی کا مجھ سے متوازن سلوک تھا اور میں نے اپنی زندگی کے بہترین دن اس کے ساتھ گزارے۔ شادی کے پہلے سال ہی میری بیوی امید سے تھی اور میں نئے مہمان کا بے چینی سے منتظر تھا لیکن ایسے موقع پر مجھے وزارت خانہ سے یہ حتمی حکم موصول ہوا کہ میں وقت ضائع کیے بغیر فوراً عراق پہنچوں جو برسہا برس سے عثمانی خلافت کی زیر استحصال تھا۔

ہم وہاں بیوی جو اپنے پہلے بچے کے انتظار میں تھی اس حکمنامہ سے بہت آزرده ہوئے لیکن ملک و ملت سے محبت، احساس جاہ طلبی اور اپنے ساتھیوں سے رقابت، تمام کمزوریاں و جذبات اور بے چینی کی محبت پر چھا گئی اور میں نے بغیر تردد کے اس نئی ماموریت کو قبول کر لیا۔

تک ملتوی رکھوں۔ جب میں اس سے رخصت ہو رہا تھا تو وہ اور میں دونوں بے تحاشا رو رہے تھے۔ اس پر مجھ سے زیادہ رقت طاری تھی اور وہ کہہ رہی تھی: مجھے بھول نہ جانا، خط ضرور لکھتے رہنا، میں بھی اپنے بچے کے سنہری مستقبل کے بارے میں تمہیں لکھتی رہوں گی۔ اس کی باتوں نے میرا دل پسچ دیا اور مجھے سوچ کی اس منزل تک پہنچایا کہ میں اپنے سفر کو کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو قابو پایا اور اس سے رخصت ہو کر نئے احکامات حاصل کرنے کے لیے وزارت خانہ روانہ ہو گیا۔

سمندروں میں چھ ماہ کے طویل سفر کے بعد آخر کار میں بصرہ پہنچا۔ اس شہر میں رہنے والے زیادہ تر وہیں اطراف کے قبائل تھے جن میں ایرانی اور عرب اقوام کے دورہم بازو شیعہ اور سنی ایک ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ بصرہ میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اپنی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اہل تشیع اور ایرانیوں سے مل رہا تھا۔ یہاں یہ بات نامناسب نہیں ہوگی اگر میں اہل تشیع اور اہل تسنن کے عقائد کے بارے میں مختصر کہتا چلوں۔ شیعہ حضرات، حضرت محمد (ﷺ) کے داماد اور چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کے محبت ہیں اور ان کو حضرت محمد (ﷺ) کا برحق جانشین سمجھتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) نے نقش صریح کے ذریعہ حضرت علی کو اپنا جانشین منتخب فرمایا تھا اور آپ کے گیارہ فرزند یکے بعد دیگرے امام اور رسول خدا کے برحق جانشین ہیں۔

میری سوچ کے مطابق حضرت علی اور آپ کے دو فرزند امام حسن اور امام حسین کی خلافت کے بارے میں شیعہ حضرات مکمل طور پر حق بجانب ہیں کیونکہ اپنے مطالعات کی بنیاد پر بعض شواہد و اسناد میرے اس دعوے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی ہی وہ ہستی تھے جو ممتاز صفات کے حامل تھے اور صحیح طور پر فوج اور اسلامی حکومت کی سربراہی کے اہل تھے۔ امام حسن اور امام حسین کی امامت کے بارے میں حضرت محمد (ﷺ) کی بہت سی حدیثیں دستیاب ہیں اور اسلئے کو بھی ان سے انکار نہیں



ہے اور دونوں فریق اس پر متحد ہیں البتہ مجھے باقی نو افراد کی جانشینی میں تردد ہے جو حسین بن علی (علیہ السلام) کی اولاد سے ہیں اور شیعہ حضرات انہیں خصوصاً برحق مانتے ہیں۔ حالانکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبران افراد کی امامت کی خبر دیں جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ہوں؟ لیکن اگر محمد (ﷺ) اللہ کے برحق پیغمبر ہوں تو پھر وہ غیب کی خبر دے سکتے ہیں جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے آئندہ برسوں کی خبریں دی ہیں لیکن حضرت محمد (ﷺ) کی نبوت تو عیسائیوں کے نزدیک مسلم نہیں ہے (۱) مسلمانوں کا کہنا ہے کہ قرآن، پیغمبر کی نبوت پر بھرپور دلیل ہے لیکن میں نے جتنا بھی قرآن پڑھا مجھے ایسی کوئی دلیل نہیں ملی۔ (۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن ایک بلند پایہ کتاب ہے اور اس کا مقام تورات اور انجیل سے بڑھ کر ہے۔ قدیم داستانیں، اسلامی احکام، آداب، تعلیمات اور دیگر باتوں نے اس کتاب کو زیادہ معتبر اور زیادہ ممتاز بنا دیا ہے۔ لیکن کیا صرف یہ خصوصی فوقیت محمد (ﷺ) کی سچائی پر دلیل بن سکتی ہے؟ میں حیران ہوں کہ ایک صحرائین جسے لکھنا اور پڑھنا بھی نہ آتا ہو کس طرح ایک ارفع و اعلیٰ کتاب انسانیت کے حوالے کر سکتا ہے۔ یہ کام تو کوئی پڑھا لکھا اور صاحب استعداد آدمی بھی اپنی پوری ہوشمندی کے باوجود انجام نہیں دے سکتا۔ پھر کس طرح ایک صحرائی عرب بغیر تعلیم کے ایک ایسی کتاب لکھ سکتا ہے؟ اور جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں: ”کیا یہ کتاب پیغمبر کی نبوت پر دلیل ہو سکتی ہے؟“

(۱) انگریز جاسوس سے اس طرح کے نظریات خلاف توقع نہیں ہیں خاص طور پر جب اسے مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا ہو۔

(۲) کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی قرآن پاک پڑھنے کا دعویٰ بھی کرے لیکن اس کی نظر اس آیت پر نہ گئی ہو جس میں حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کو جناب ختمی مرتبت کی بعثت کی خبر دیتے ہیں؟  
وَمَشَرَا بِرَسُولِ يَأْتِيهِ مِنَ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (سورہ صف آیت ۶) ”اس کے علاوہ بھی جناب رسالت ﷺ کی رسالت پر صریحاً آیات موجود ہیں۔“

میں نے اس بارے میں حقیقت سے آگاہی کیلئے بہت مطالعہ کیا ہے۔ لندن میں جب میں نے ایک پادری کے سامنے اس موضوع کو پیش کیا تو وہ بھی کوئی قابل اطمینان جواب نہ دے سکا۔ ترکی میں بھی میں نے شیخ احمد سے کئی دفعہ اس موضوع پر بات چیت کی مگر وہاں بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں لندن کے پادری کے مقابل شیخ احمد سے اتنی کھل کر گفتگو نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں میرا پول نہ کھل جائے یا پھر کم از کم پیغمبر اسلام کے بارے میں اسے میری نیت پر شک نہ ہو جائے۔ بہر حال میں حضرت محمد (ﷺ) کی قدر و منزلت کی عظمت اور بزرگی کا قائل ہوں۔ بے شک آپ کا شمار ان بافضیلت افراد میں ہوتا ہے جن کی کوششیں تربیت بشر کے لیے ناقابل انکار ہیں اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے لیکن پھر بھی مجھے ان کی رسالت میں شک ہے۔ تاہم اگر نہیں پیغمبر تسلیم نہ بھی کیا جائے تو بھی ان کی بزرگی ان افراد سے بڑھ کر ہے جنہیں ہم نوابغ سمجھتے ہیں۔ محمد (ﷺ) تاریخ کے ہوشمند ترین افراد سے زیادہ ہوشمند تھے۔ اہل سنت کہتے ہیں: حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) مستند آراء کی بنیاد پر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے زیادہ امر خلافت کے حقدار تھے۔ اسی طرح انہوں نے خلفاء کے انتخاب میں قول پیغمبر کو بھلا کر براہ راست اقدام کیا۔ اس طرح کے اختلافات اکثر ادیان، بالخصوص عیسائیت میں پائے جاتے ہیں لیکن شیعہ سنی اختلافات کا ناقابل فہم پہلو اس کا استقرار یا مسلسل جاری رہنا ہے جو حضرت علی اور حضرت عمر کے گزرنے کے صدیوں بعد بھی اب تک اسی زور و شور سے باقی ہے۔ اگر مسلمان ہیبتاً عقل سے کام لیتے تو گزری تاریخ اور بھولے زمانے کے بجائے آج کے بارے میں سوچتے۔ ایک دفعہ میں نے شیعہ سنی اختلافات کے موضوع کا اپنی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کی سامنے پیش کیا اور ان سے کہا: ”مسلمان اگر زندگی کے صحیح مفہوم کو سمجھتے تو ان اختلافات کو چھوڑ بیٹھتے اور وحدت و اتحاد کی بات کرتے“۔ اچانک صدر جلسہ نے میری بات کاٹنے ہوئے کہا:

تمہارا کام مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی آگ بھڑکانا ہے نہ کہ تم انہیں اتحاد اور یک جہتی کی دعوت دو۔

عراق جانے سے پہلے سیکرٹری نے اپنی ایک نشست میں مجھ سے کہا:  
ہمہمے! تم جانتے ہو کہ جنگ اور جھگڑے انسان کے لیے ایک فطری امر ہیں اور جب سے خدا نے آدم کو خلق کیا اور اس کے صلب سے ہابیل اور قابیل پیدا ہوئے اختلافات نے سر اٹھایا اور اب اس کو حضرت عیسیٰ کی بازگشت تک اسی طرح جاری رہنا ہے۔ ہم انسانی اختلافات کو پانچ باتوں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) نسلی اختلافات

(۲) قبائلی اختلافات

(۳) ارضی اختلافات

(۴) قومی اختلافات

(۵) مذہبی اختلافات

اس سفر میں تمہارا اہم ترین فریضہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا اور انہیں ہوا دینے کے طریقوں کو سیکھنا ہے۔ اس سلسلے میں جتنی بھی معلومات تمہاری دسترس میں ہیں اس کی اطلاع لندن کے حکام تک پہنچانا ہے۔ اگر تم اسلامی ممالک کے بعض حصوں میں سنی شیعہ فساد برپا کر دو تو گویا تم نے حکومت برطانیہ کی عظیم خدمت کی ہے۔ جب تک ہم اپنے لو آ باد یاتی علاقوں میں نفاق، تفرقہ، شورش اور اختلافات کو دیکھتے ہیں تو اس کے پر سکون اور مرفوع الحال نہیں ہو سکتے۔ ہم اس وقت تک اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتے جب تک اس کے قلمرو میں شہر شہر، گلی گلی فتنہ و فساد برپا نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ اگر یوں کی مختصر سی قوم ہوائے اس ہنکنڈے کے



پس اے ہمفرے! تمہیں چاہیے کہ پہلے اپنی پوری قوت صرف کر کے ہنگامے، شور شرابے، پھوٹ اور اختلافات کی کوئی راہ نکالو اور پھر وہاں سے اپنے کام کا آغاز کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت عثمانی حکومتیں کمزور ہو چکی ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم لوگوں کو ان کے حکمرانوں کے خلاف بھڑکاؤ۔ تاریخی حقائق کی بنیاد پر ہمیشہ انقلابات، حکمرانوں کے خلاف عوام کی شورش سے وجود میں آئے ہیں۔ جب کبھی کسی علاقے کے عوام میں پھوٹ اور انتشار پڑ جائے تو استعمار کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

بصرہ پہنچ کر میں ایک مسجد میں داخل ہوا۔ مسجد کے پیش امام اہلسنت کے مشہور عالم شیخ عمر طائی تھے۔ میں نے انہیں دیکھ کر بڑے ادب سے سلام کیا لیکن شیخ ابتدائی لمحہ ہی سے مجھ سے مشکوک ہوا اور میرے حسب نسب اور گزشتہ زندگی کے بارے میں مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ میرے چہرے اور لہجہ نے اسے شک میں ڈال دیا تھا لیکن میں نے بڑی ترکیب سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے بچالیا اور شیخ کے جواب میں کہا:

میں ترکی میں واقع ”آغدیر“ کا رہنے والا ہوں اور مجھے قسطنطنیہ کے شیخ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ میں نے وہاں خالد بڑھئی کے پاس بھی کام کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ترکی میں میں نے جو کچھ سیکھا تھا وہ سب اس سے بیان کیا۔ میں نے دیکھا کہ شیخ حاضرین میں سے کسی کو آنکھ کے ذریعے اشارہ کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ مجھے ترکی آتی بھی ہے کہ نہیں۔ اس شخص نے آنکھوں سے حامی بھری۔ میں دل میں بہت خوش ہوا کہ میں نے کسی حد تک شیخ کا دل جیت لیا ہے لیکن کچھ ہی دیر کے بعد مجھے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ شیخ کا شیہہ ابھی اپنی جگہ باقی ہے اور وہ مجھے عثمانیوں کا جاسوس سمجھتا ہے۔ مشہور تھا کہ شیخ، بصرہ کے گورنر کا سخت مخالف تھا جسے عثمانیوں نے معین کیا تھا۔

بہر حال میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں شیخ کی مسجد سے ایک

علاقے کے ایک غریب مسافر خانہ میں منتقل ہو جاؤں۔ میں نے وہاں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ مسافر خانہ کا مالک ایک احمق آدمی تھا جو ہر صبح سویرے مسافروں کو پریشان کیا کرتا تھا اور مجھے نماز کے لیے جگاتا تھا اور پھر سورج نکلنے تک قرآن پڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ جب میں اس سے کہتا کہ قرآن پڑھنا واجب نہیں ہے پھر کیوں تمہیں اس امر میں اتنا اصرار ہے؟ تو وہ کہتا کہ طلوع آفتاب سے قبل کی نیند فقرا اور بدبختی لاتی ہے اور اس طرح مسافر خانہ کے تمام مقیم بدبختی کا شکار ہو جائیں گے۔ مجھے اس کی بات ماننی پڑی کیونکہ وہ مجھے وہاں سے نکالے جانے کی دھمکی دیتا تھا۔ ہر روز صبح میں نماز کے لیے اٹھتا تھا اور پھر ایک گھنٹہ یا اس سے زیادہ وقت تک قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔

میری مشکل یہیں ختم نہیں ہوئی۔ ایک دن مسافر خانے کے مالک مرشد آفندی نے آ کر کہا: جب سے تم نے اس مسافر خانے میں رہائش اختیار کی ہے مصیبتوں نے میرا گھر دیکھ لیا ہے اور اس کی وجہ تم اور تمہاری لائی ہوئی نحوست ہے اس لیے کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اور کسی کو اپنا شریک حیات نہیں بنایا ہے تمہیں یا شادی کرنی ہوگی یا پھر یہاں سے جانا ہوگا۔

میں نے کہا: آفندی! میں شادی کے لیے سرمایہ کہاں سے لاؤں؟ اس دفعہ میں نے اپنے آپ کو شادی کے ناقابل ظاہر کرنے سے احتراز کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مرشد آفندی نوہ لگائے بغیر میری بات پر یقین نہیں کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

مرشد آفندی نے جواب دیا: اور نام کے ضعیف الاعتقاد مسلمان! کیا تم نے قرآن کا مطالعہ نہیں کیا جہاں اللہ کریم فرماتا ہے:

”وہ لوگ جو فقر میں مبتلا ہیں خداوند انہیں اپنی بزرگی سے مالا مال کر دے گا۔“

میں حیران تھا کہ اس نا سمجھ انسان سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں۔ آخر کار میں نے کہا: آپ کا ارشاد سچا ہے لیکن میں رقم کے بغیر شادی کیسے کر سکتا ہوں؟ کیا آپ

ضروری اخراجات کے لیے مجھے کچھ رقم قرض دے سکتے ہیں۔ کیونکہ اسلام میں حق مہر ادا کیے بغیر کوئی عورت کسی کے عقد میں نہیں آ سکتی۔

آفتدی کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا اور پھر قرض کی بات کرنے کے بجائے اچانک سر بلند کیا اور اونچی آواز میں چیخا: مجھے کچھ نہیں معلوم یا تمہیں شادی کرنی ہوگی یا پھر رجب کی پہلی تاریخ تک کمرہ چھوڑنا ہوگا۔ اس دن جمادی الثانی کی پانچویں تاریخ تھی اور صرف ۲۵ دن میرے پاس تھے۔

اسلامی مہینوں کے ناموں کے بارے میں بھی یہاں کچھ تذکرہ نامناسب نہ ہوگا

(۱) محرم (۲) صفر (۳) ربیع الاول

(۴) ربیع الثانی (۵) جمادی الاول (۶) جمادی الثانی

(۷) رجب (۸) شعبان (۹) رمضان

(۱۰) شوال (۱۱) ذوالقعد (۱۲) ذوالحجہ

ہر مہینہ چاند کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰ دن سے اوپر نہیں جاتا لیکن کبھی

کبھی ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ مسافر خانہ کے مالک کی سخت گیری کے سبب مجھے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔ میں نے یہاں بھی ایک ترکھان کی دکان پر اس شرط کے ساتھ نوکری کر لی کہ وہ مجھے رہنے اور کھانے کی سہولت فراہم کریگا اور اس کے عوض مزدوری کم دے گا۔ میں رجب سے پہلے ہی نئی جگہ منتقل ہو گیا اور ترکھان کی دکان پر پہنچا۔ ترکھان عبدالرضا نہایت شریف اور محترم شخص تھا اور مجھ سے اپنے بیٹوں جیسا سلوک کرتا تھا۔

عبدالرضا ایرانی الاصل شیعہ تھا اور خراسان کا رہنے والا تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے فارسی سیکھنا شروع کی۔ دوپہر کے وقت اس کے پاس بصرہ میں مقیم ایرانی جمع ہوتے تھے جو سب کے سب شیعہ تھے۔ وہاں بیٹھ کر ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی

تھی۔ کبھی سیاست اور معیشت عنوان کلام ہوتا تھا اور کبھی عثمانی حکومت کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ خاص طور پر سلطنت وقت اور استنبول میں مقرر ہونے والا خلیفہ مسلمین ان کی تنقید کا نشانہ ہوتا لیکن جو نہیں کوئی اجنبی گا ہک دکان میں آتا وہ سب کے سب خاموش ہو جاتے اور ذاتی دلچسپی کے متعلق غیر اہم باتیں ہونے لگتیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کیونکر ان کے لیے قابل اعتماد تھا اور وہ میرے سامنے ہر قسم کی گفتگو کو جائز سمجھتے تھے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ انہوں نے مجھے آذر بائجان کارہنے والا خیال کیا تھا کیونکہ میں ترکی بات چیت کرتا تھا اور آذر بائجانوں کی طرح میرا چہرہ سرخ و سفید تھا۔

ان دنوں جب میں ترکھان کا کام کرتا تھا میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو وہاں آتا جاتا رہتا تھا اور ترکی، فارسی اور عربی زبانوں میں گفتگو کرتا تھا۔ وہ دینی طالب علموں کا لباس پہنتا تھا۔ اس کا نام محمد بن عبدالوہاب تھا۔ وہ ایک اونچاڑنے والا، ایک جاہ طلب اور نہایت غصیلا انسان تھا۔ اسے عثمانی حکومت سے سخت نفرت تھی اور وہ ہمیشہ اس کی برائی کرتا تھا لیکن حکومت ایران سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ ترکھان عبدالرضا سے اس کی دوستی کی وجہ مشترک یہ تھی کہ وہ دونوں ہی عثمانی خلیفہ کو اپنا سخت ترین دشمن سمجھتے تھے لیکن میرے علم میں یہ بات نہ آسکی کہ اس نے عبدالرضا ترکھان سے کس طرح دوستی بڑھائی تھی جبکہ یہ سنی اور وہ شیعہ تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ اس نے فارسی کہاں سے سیکھی تھی؟ البتہ بصرہ میں شیعہ سنی مسلمان ایک ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے روابط دوستانہ تھی اور وہاں فارسی اور عربی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں تاہم ترکی سمجھنے والوں کی تعداد بھی وہاں کچھ کم نہ تھی۔

محمد عبدالوہاب ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کا ذہن شیعہ سنی تعصبات سے بالکل پاک تھا حالانکہ وہاں بیشتر سنی حضرات شیعوں کے خلاف تھے اور بعض سنی مفتی شیعوں



کی تکفیر بھی کرتے تھی۔ شیخ محمد کے نزدیک حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی مکاتب فکر میں سے کسی مکتب فکر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ وہ کہتا تھا کہ خدا نے جو کچھ قرآن میں کہہ دیا ہے بس وہی ہمارے لیے کافی ہے۔

ان چار مکاتب فکر کی داستان کچھ یوں ہے کہ حضرت پیغمبر اکرم (ﷺ) کی وفات کے سو سال بعد عالم اسلام میں بلند پایہ علماء کا ظہور عمل میں آیا جن میں سے چار افراد ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، مالک بن انس اور محمد بن ادریس شافعی اہل سنت کی پیشوائی کے مقام تک پہنچے۔ عباسی خلفاء کا زمانہ تھا اور ان عباسی خلفاء نے مسلمانوں پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ مذکورہ چار افراد کے علاوہ کسی کی تقلید نہ کریں اگرچہ کوئی قرآن و سنت میں ان سے بڑھ کر دسترس کیوں نہ رکھتا ہو۔ عباسی خلفاء نے ان کے علاوہ کسی متبر اور اعلیٰ پایہ عالم کو ان کے مقابل میں ابھرنے نہیں دیا اور اس طرح درحقیقت انہوں نے علم کے دروازے کو بند کر دیا اور یہ بات اہل سنت و الجماعت کے فکری جمود کا باعث بنی۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات نے اہل سنت کی اس جمودی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے عقائد و نظریات کو وسیع پیمانے پر منتشر کرنا شروع کیا اور دوسری صدی ہجری کے آغاز میں باوجود اس کے کہ شیعہ آبادی اہل سنت کی مقابل میں دس فیصد تھی ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہونے لگا اور وہ اہل سنت کی ہم پایہ ہو گئے اور یہ ایک فطری امر تھا کیونکہ شیعہ حضرات کے پاس اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہ بات مسلمانوں کی تازگی فکر، اسلامی فقہ کی پیشرفت اور نئی روشنی میں قرآن و سنت کے تہم کا باعث بنی اور اسی نے اسلام کو نئے زمانوں کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اجتہاد ہی وہ بڑا وسیلہ تھا جو فکری جمود سے نبرد آزما رہا اور اس کے ذریعے اسلام نے جلاء پائی اور فکروں میں مقید کرنا، مسلمانوں کے لیے جستجو اور تلاش کے راستوں کو بند کرنا اور نئی بات سے ان کی سماعت کو روکنا اور وقت کے تقاضوں سے انہیں بے توجہ رکھنا دراصل وہ پوشیدہ اسلحہ تھا جس نے مسلمانوں کی پیشرفت روک دی۔ ظاہر ہے جب دشمن کے ہاتھ

میں نیا اسلحہ ہو اور آپ اپنے پرانے زنگ آلود اسلحہ سے اس کا مقابلہ کریں گے تو یقیناً جلد یا بدیر آپ کو ہزیمت اٹھانا پڑے گی۔ میں پشین گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اہل سنت کے صاحبان عقل افراد بہت جلد ہی مسلمانوں پر اجتہاد کا دروازہ کھول دیں گے اور یہ کام میرے اندازے کے مطابق اگلی صدی تک رو بہ عمل آئے گا اور سو سال بعد مسلمانوں میں اجتہاد کے حامی شیعوں کی اکثریت ہوگی اور اہل تسنن اقلیت میں رہ جائیں گے۔

اب میں شیخ محمد عبدالوہاب کے بارے میں عرض کروں یہ شخص قرآن و حدیث کا اچھا مطالعہ رکھتا تھا اور اپنی انکار کی حمایت میں بزرگان اسلام کے اقوال و آراء کو بطور سند پیش کرتا تھا لیکن کبھی کبھی اس کی فکر مشاہر علماء کے خلاف ہوتی تھی۔ وہ بات بات پر کہتا:

عظیمبر خدا (ﷺ) نے صرف کتاب اور سنت کو ناقابل تغیر اصول بنا کر ہمارے لیے پیش کیا اور کبھی نہیں کہا کہ صحابہ کرام اور ائمہ دین کے فرمودات اہل اور وحی منزل ہیں۔ پس ہم پر واجب ہے کہ ہم صرف کتاب و سنت کی پیروی کریں۔ علماء ائمہ اربع حتیٰ کہ صحابہ کی رائے خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو ہمیں ان کے اتفاق اختلاف پر اپنے دین کو استوار نہیں کرنا چاہیے۔

ایک دن اس کی ایران سے آنے والے ایک عالم سے کھانے کے دسترخوان پر جھڑپ ہوگئی۔ اس عالم کا نام شیخ جوادی تھا اور اسے عہد المرضاہ کا کھانے نے اپنے پاس مہمان بلایا تھا۔ شیخ جوادی کے محمد بن عبدالوہاب سے اصولی اختلافات تھے اور ان کی گفتگو نے جلد ہی تلخی اور تشریحی کارنگ اختیار کر لیا۔ مجھے ان کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو تو یاد نہیں البتہ جو مجھے یاد ہیں، میں ان کو یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ جنی نے ان جملوں سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور محمد بن عبدالوہاب سے کہا:

”اگر تم ایک آزاد خیال انسان ہو اور اپنے دعوے کے مطابق اسلام کا کافی مطالعہ کر چکے ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم حضرت علی کو وہ فضیلت نہیں دیتے جو شیعہ دیتے ہیں؟“

محمد نے جواب دیا، اس لیے کہ حضرت عمر اور دیگر افراد کی طرح ان کی باتیں بھی

میرے لیے حجت نہیں ہیں۔ میں صرف کتاب و سنت کو مانتا ہوں۔

تمہاری: اچھا اگر تم سنت کے عامل ہو تو کیا پیغمبر (ﷺ) نے یہ نہیں کہا تھا؟ میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں” (أَنَا مَدِينَتُهُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا) اور کیا یہ کہہ کر پیغمبر (ﷺ) نے علی اور صحابہ کے درمیان فرق قائم نہیں کیا؟

محمد اگر ایسا ہے تو پھر پیغمبر (ﷺ) نے اپنے مقام پر کہی ہے کہ: ”میں نے تمہارے درمیان کتاب اور اہلبیت کو چھوڑا ہے“ (إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ الثَّقَلَيْنِ كِتَابُ اللَّهِ وَعُتْرَتِي أَهْلَ الْبَيْتِ) بے شک علی اہلبیت کے سربراہ اور وہ افراد میں سے ہیں۔

محمد نے اس حدیث کو جھٹلایا لیکن شیخ قمی نے اصول کافی کے اسناد کی بنیاد پر پیغمبر (ﷺ) سے اس حدیث کو ثابت کیا اور محمد کو خاموش ہونا پڑا۔ اب اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اچانک اس نے شیخ پر اعتراض ٹھونکا: ”پیغمبر (ﷺ) نے ہمارے لئے صرف کتاب اور اپنے اہلبیت کو باقی رکھا ہے تو پھر سنت کہاں گئی؟“

تمہاری: جواب دیا: سنت اسی کتاب کی تفسیر و تشریح کا نام ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں پیغمبر خدا (ﷺ) نے فرمایا ہے اللہ کی کتاب اور میرے اہلبیت، یعنی کتاب خدا اس تشریح و تفسیر کے ساتھ جو سنت کہلاتی ہے اور اس کے بعد سنت کی تکرار کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

محمد نے کہا: اگر آپ کے دعوے کے مطابق حضرت یا اہل بیت علی کلام الہی کی تفسیر ہیں تو پھر کیوں متن حدیث میں اس کا اضافہ ہوا ہے؟

تمہاری: جواب دیا ”جناب رسالت مآب (ﷺ) کی وفات کے بعد امت محمدی کو قرآن سبھانے والے کی اشد ضرورت تھی کیونکہ قوم اپنی زمین کی کو احکام الہی پر منطبق کرنا چاہتی تھی اس لیے پیغمبر کریم (ﷺ) نے اپنے نبی علم کی بنیاد پر کتاب الہی کو اصل ثابت اور عزت کو مفسر و شارح کتاب بنا کر امت کے حوالے کیا۔“

حیرانی کے ساتھ ساتھ مجھے ان کی گفتگو سے بڑا مزا آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ محمد بن عبدالوہاب اس ضعیف العرش شیخ جو ادنیٰ کے آگے ایک ایسی چیز یا کی مانند پھڑ پھڑا رہا تھا جسے نفس میں بند کر دیا گیا ہو اور اس کے پرواز کی راہ مسدود ہو گئی ہو۔

محمد بن عبدالوہاب سے میل جول اور ملاقاتوں کے ایک سلسلہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ برطانوی حکومت کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ شخص بہت مناسب دکھائی دیتا ہے۔ اس کی اونچاڑنے کی خواہش، جاہ طلبی، غرور، علماء و مشائخ اسلام سے اس کی دشمنی، اس حد تک خود سری کو خلفاء راشدین بھی اس کی تنقید کا نشانہ بنیں اور حقیقت کے سراسر خلاف قرآن و حدیث سے استفادہ اس کی کمزوریاں تھیں جس سے بڑی آسانی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

میں نے سوچا کہاں یہ مغرور نوجوان اور کہاں استنبول کا وہ ترک بوڑھا آدمی (احمد آفندی) جس کے افکار و کردار گویا ہزار سال پہلے کے افراد کی تصویر کشی کرتے تھے۔ اس نے اپنے اندر ذرا بھی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔ حنفی مذہب سے تعلق رکھنے والا وہ بوڑھا شخص ابو حنیفہ کا نام زبان پر لانے سے پہلے اٹھ کر وضو کرتا تھا یا مثلاً صحیح بخاری کے مطالعہ کو اپنا فرض سمجھتا تھا جو اہل سنت کے نزدیک حدیثوں کی نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے اور وہاں بھی وضو کر کے بغیر کتاب کو نہیں چھو تا تھا اور اس کے بالکل برعکس شیخ محمد بن عبدالوہاب، ابو حنیفہ کی تحقیر کرتا تھا اور اسے ناقابل اعتبار سمجھتا تھا۔ محمد کہتا تھا: ”میں ابو حنیفہ سے زیادہ جانتا ہوں“۔ اس کا دعویٰ تھا کہ نصف صحیح بخاری بالکل لچر اور بیہودہ ہے۔

بہر صورت میں نے عبدالوہاب سے بہت گہرے مراسم قائم کر لیے اور ہماری ملاقاتیں ناقابل جدائی انتظام پیدا ہو گیا۔ میں بار بار اس کے کانوں میں یہ رس گھولتا تھا کہ ”ابو حنیفہ حضرت علی اور حضرت عمر سے کہیں زیادہ صاحب استعداد بنایا ہے اور ان کے بعد ان کے بعد ہی نہیں آئے۔ اگر تم جناب رسالت مآب ﷺ کے زمانے میں



ہوتے تو یقیناً ان کی جانشینی کا شرف تمہیں ہی ملتا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) میں ہمیشہ پر امید لہجے میں اس سے کہتا:

میں چاہتا ہوں کہ اسلام میں جس انقلاب کو رونما ہونا ہے وہ تمہارے ہی مبارک ہاتھوں سے انجام پذیر ہو اس لیے کہ صرف تم ہی وہ شخصیت ہو جا اسلام کو زوال سے بچا سکتے ہو اور اس سلسلے میں سب کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔“

میں نے عبدالوہاب کے ساتھ طے کیا ہم دونوں بیٹھ کر علماء، مفسرین، پیشوایان دین و مذہب اور صحابہ کرام سے ہٹ کر نئے افکار کی بنیاد پر قرآن مجید پر گفتگو کریں۔ ہم قرآن پڑھتے اور آیات کے بارے میں اظہار خیال کرتے تھے۔ میرا لائحہ عمل یہ تھا کہ میں کسی طرح اسے انگریز نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے دام میں پھنسا دوں۔

میں نے آہستہ آہستہ اس اونچی اڑان والے خود برست انسان کو اپنی گفتگو کی لپیٹ میں لینا شروع کیا یہاں تک کہ اس نے حقیقت سے کچھ زیادہ ہی آزاد خیال بننے کی کوشش کی۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا: ”کیا جہاد واجب ہے؟“ اس نے کہا: کیوں نہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے: ”کافروں سے جنگ کرو۔“

میں نے کہا: خداوند عالم فرماتا ہے: کافروں اور منافقوں دونوں سے جنگ کرو اور اگر کافروں اور منافقوں سے جنگ واجب ہے تو پھر پیغمبر (ﷺ) نے منافقوں سے کیوں جنگ نہیں کی؟“

محمد بن عبدالوہاب نے جواب دیا: ”جہاد صرف میدان جنگ ہی میں نہیں ہوتا۔ پیغمبر خدا نے اپنی رفتار و گفتار کے ذریعے منافقوں سے جنگ کی ہے۔“

میں نے کہا: ”پھر اس صورت میں کفار کے ساتھ جنگ بھی رفتار و گفتار کے ساتھ واجب ہے۔“

اس نے جواب دیا: ”نہیں، اس لیے کہ پیغمبر (ﷺ) نے جنگ کے میدان میں ان کے ساتھ جہاد کیا ہے۔“

میں نے کہا: ”کفار کے ساتھ رسول خدا (ﷺ) کی جنگ اپنے دفاع کے لیے تھی کیونکہ وہ ان کی جان کے دشمن تھے۔“

محمد بن عبدالوہاب نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

ایک اور دن میں نے اس سے کہا: ”کیا عورتوں سے متعہ جائز ہے؟“

اس نے کہا: ”ہرگز نہیں۔“

میں نے کہا: ”پھر کیوں قرآن نے اسے جائز قرار دیتے ہوئے کہا ہے؟“ اور

جب تم ان سے حد کرو تو ان کا حق مہر ادا کرو۔“

اس نے کہا: ”ہاں یہ آیت تو اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے

حرام قرار دیا کہ: حد پیغمبر (ﷺ) کے زمانہ میں حلال تھا، اسے حرام قرار دیتا ہوں اور اب جو

اس کا مرتکب ہوگا میں اسے سزا دوں گا۔“

میں نے کہا بڑی عجیب بات ہے۔ تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی کرتے ہو

اور پھر اپنے آپ کو اس سے زیادہ صاحب عقل بھی کہتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیا حق

پہنچتا ہے کہ وہ حلال (ﷺ) کو حرام کریں۔ تم نے قرآن کو بھلا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی

راے کو تسلیم کر لیا؟

محمد بن عبدالوہاب نے چپ سادھ لی اور خاموشی اس کی رضامندی کی دلیل تھی۔

اس کے بعد اس کی خیالات درست کر کے میں نے اس کے ”حیوانی خیالات“ کو ابھارنا

شروع کر دیا۔ وہ ایک غیر متاثر شخص تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: ”متعہ کے ذریعے اپنی

حیوانی خواہشات کو پوری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

محمد بن عبدالوہاب نے رضا اور رغبت کی علامت سے اپنا سر جھکا لیا۔  
 میں اپنے فرائض کے انتہائی اہم موڑ پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا  
 کہ میں بہر حال تمہارے لیے اس کا انتظام کر دوں گا، مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں  
 محمد بن عبدالوہاب بصرہ کے ان سنیوں سے خوف زدہ نہ ہو جائے جو اس بات کے مخالف  
 تھے۔ میں نے اطمینان دلایا کہ ہمارا پروگرام بالکل مخفی رہے گا یہاں تک کہ عورت کو بھی  
 تمہارا نام نہیں بتایا جائے گا۔ اس گفتگو کے بعد میں اس بدقماش نصرانی عورت کے پاس  
 گیا جو انگلستان کے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کی طرف سے بصرہ میں عصمت فروشی  
 پر معمور تھی اور مسلم نوجوانوں کو بے راہ روی پر ابھارتی تھی۔ میں نے اس سے تمام  
 واقعات بیان کیے۔ جب وہ راضی ہو گئی تو میں نے اس کا عارضی نام ”صفیہ“ رکھا اور کہا  
 کہ میں شیخ کو لے کر اس کے پاس آؤں گا۔

مقررہ دن میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کو لے کر صفیہ کے گھر پہنچا۔ ہم دونوں کے  
 سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نے ایک اشرفی مہر پر ایک ہفتہ کے لیے صفیہ  
 سے عقد کیا۔ مختصر یہ کہ میں باہر اور صفیہ اندر سے محمد بن عبدالوہاب کو آئندہ کے پروگراموں  
 کے تیار کر رہے تھے۔ صفیہ نے احکام دین کی پامالی اور آزادی رائے کا پرفیکٹ مزہ محمد بن  
 عبدالوہاب کو چکھا دیا تھا۔

میں اس تقریب کے تیسرے دن پھر محمد بن عبدالوہاب سے ملا اور ہم نے ایک  
 بار پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ اس بار شراب کی حرمت زیر بحث تھی۔ میری کوشش تھی کہ  
 میں ان آیات کو رد کروں جو محمد بن عبدالوہاب کے نزدیک حرمت شراب پر دلیل تھیں۔ میں  
 نے اس سے کہا: ”اگر معاویہ، خلفائے بنو امیہ اور بنی عباس کی شارب نوشی ہمارے نزدیک  
 مسلم ہو تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ تمام پیشوایان دین و مذہب گمراہی کی زندگی بسر کرتے ہوں  
 اور تمہا تم سچے راستے پر ہوا بے شک وہ لوگ کتاب الہی اور سنت رسول کو ہم سے زیادہ بہتر

جانتے تھے۔ پس یہ بات سامنے آتی ہے کہ ارشادات خدا اور رسول (ﷺ) سے ان بزرگوں نے جو استنباط کیا تھا وہ شراب کی حرمت نہیں بلکہ اس کی کراہت تھی۔ اس کے علاوہ یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں صراحت سے شراب پینے کی اجازت ہے حالانکہ یہ بھی الٰہی ادیان ہیں اور اسلام ان ادیان کے پیغمبروں کا معتقد ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شراب اللہ کے بھیجے ہوئے ایک دین میں حلال اور دوسرے میں حرام ہو؟

کیا یہ سب ادیان برحق یا خدائے یکتا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں؟

ہمارے پاس تو یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک شراب پیتے رہے جب تک یہ آیت نازل نہیں ہوئی: ”کیا تم شراب اور جوئے سے دستبردار نہیں ہو گے؟“ اسی لیے رسول خدا ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شراب نوشی پر حد جاری فرماتے مگر آپ کا ان پر حد جاری نہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ شراب حرام نہیں ہے۔

محمد بن عبدالوہاب جو بڑے غور سے میری گفتگو سن رہا تھا اچانک سنبھلا اور کہا: ”روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شراب میں پانی ملا کر پیتے تھے تاکہ اس کی وہ کیفیت دور ہو جائے جو نشہ پیدا کرتی ہے۔ وہ کہتے تھے شراب کی مستی حرام ہے نہ کہ شراب، وہ شراب جس سے نشہ طاری نہ ہو، وہ حرام نہیں ہے“ (اب یہ امام الوہابیہ پوری طرح ”ہمفرے“ کے جال میں پھنس چکا ہے، اسی لیے اس کی تائید کر رہا ہے۔) (مترجم)

محمد بن عبدالوہاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس نظریہ کو اس آیت کی روشنی میں جاننا تھا جس میں ارشاد ہوتا ہے: ”شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے اختلاف اور دشمنی پیدا کر دے اور تمہیں یاد خدا اور نماز سے باز رکھے۔“

اگر شراب میں مستی اور نشہ نہ ہو تو پینے والے پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔ لہذا شراب جس میں مستی نہیں جرام نہیں ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ شراب سے متعلق گفتگو کو صنفیہ کے گوش



گزار کیا اور اس کو تاکید کی کہ موقع ملتے ہی محمد بن عبدالوہاب کو نشہ میں چور کر دو اور جتنا ہو سکے شراب پلاؤ۔

دوسرے دن صغیہ نے مجھے اطلاع دی کہ اس نے شیخ کے ساتھ جی کھول کر شراب نوشی کی یہاں تک کہ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے چلانے لگا۔ رات کی آخری گھڑی میں کئی مرتبہ اس نے مقاربت کی اور اب اس پر نقاہت کا عالم طاری ہے اور چہرے کی آب و تاب ختم ہو چکی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ میں اور صغیہ پوری طرح محمد بن عبدالوہاب پر چھا چکے تھے۔ اس منزل پر مجھے نو آبادیاتی علاقوں کے وزیر کی سنہری بات یاد آئی جو اس نے مجھے الوداع کرتے ہوئے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا:

”ہم نے اسپین کو کفار (مراد اہل اسلام ہیں) سے شراب اور جوئے کے ذریعے دوبارہ حاصل کیا۔ اب انہیں دو طاقتوں کے ذریعے دوسری علاقوں کو بھی پامردی کے ساتھ واپس لینا ہے۔“

محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ مذہبی گفتگو کے دوران ایک دن میں نے روزہ کے مسئلہ کو ہوا دی اور کہا: ”قرآن کہتا ہے: ”روزہ تمہارے لیے بہتر ہے۔“ اس نے یہ نہیں کہا کہ تم پر واجب ہے۔“ لہذا اسلام میں روزہ واجب نہیں مستحب ہے۔“ (ہمفرے کے اس واضح غلط بیان پر عبدالوہاب نجدی اس سے ناراض ہو جاتا ہے)

اس موقع پر عبدالوہاب کو غصہ آیا اور اس نے کہا: ”تم مجھے دین سے خارج کرنا چاہتے ہو۔“

میں نے کہا: ”اے محمد بن عبدالوہاب! دین قلب کی پاکی، جان کی سلامتی اور اعتدالی کا نام ہے۔ یہ کیفیات انسان کو دوسروں پر ظلم و زیادتی سے روکتی ہیں۔ کیا حضرت عیسیٰ نے یہ نہیں کہا کہ مذہب عشق و وارفتگی کا نام ہے؟“ کیا قرآن یہ نہیں کہتا: ”یقین حاصل کرنے تک اللہ کی عبادت کرو۔ اب اگر انسان یقین کامل کی منزل پر پہنچ جائے، خدا اور روز



نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا: ”اگر تم نے رسول خدا (ﷺ) کی شان میں گستاخی کی تو ہماری تمہاری دوستی کے دروازے ہمیں سے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔“

میں نے اپنی محنتوں پر پانی پھرتے دیکھا تو فوراً اپنا موضوع گفتگو بدل دیا اور پھر اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔

اس دن کے بعد سے میرا مقصد محمد بن عبدالوہاب کو رہبری اور پیشوائی کی فکر دینا ہو گیا۔ مجھے اس کے قلب و روح میں اتر کر شیعہ سنی فرقوں کے علاوہ اسلام میں ایک تیسرے فرقے کی سربراہی کی پیش کش کو اس کے لئے قابل عمل بنانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ پہلے میں اس کے ذہن کو بیجا محبتوں اور اندھے تعصبات سے پاک کر دوں اور اس عنوان سے اس کی آزاد خیالی اور بلند پروازی کو تقویت پہنچاؤں۔ اس کام میں صفیہ بھی میری مددگار تھی کیونکہ محمد بن عبدالوہاب اسے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا اور ہر ہفتہ متعہ کی مدت کو بڑھاتا تھا۔ مختصر یہ کہ صفیہ نے محمد بن عبدالوہاب سے ضرور قرار اور اسکے تمام اختیارات چھین لیے تھے۔

میں نے اپنی ایک ملاقات میں محمد بن عبدالوہاب سے کہا: ”کیا یہ درست ہے کہ جناب رسول خدا (ﷺ) کی تمام اصحاب سے دوستی تھی؟“

اس نے جواب دیا ”ہاں“

میں نے پوچھا: ”اسلام کے قوانین دائمی ہیں یا وقتی؟“

اس نے کہا: ”بے شک دائمی ہیں“ اس لئے کہ رسول خدا (ﷺ) فرماتے ہیں

کہ: ”حلال محمد (ﷺ) قیامت تک حلال ہیں اور حرام محمد (ﷺ) قیامت تک حرام ہے“

میں نے بلا تاخیر کہا: ”ہمیں بھی ان کی سنت پر عمل کرنے ہوئے ایک دوسرے کا

دوست اور بھائی ہونا چاہیے۔“

اس نے میری پیشکش کو قبول کیا اور اس دن کے بعد سے تمام سفر و حضر میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہنے لگے۔ میں اس کوشش میں تھا کہ جس پودے کو سینچنے میں نے اپنی جوانی کے دن صرف کئے ہیں اب جتنی جلد ممکن ہو سکے اس کے پھلوں سے استفادہ کروں۔

حسب معمول میں ہر مہینے کی رپورٹ انگلستان میں نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت کو بھیجتا رہا۔ رپورٹ لکھنا اب میری عادت میں شامل ہو گیا تھا جس میں کبھی میں کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ وہاں سے جو جوابات لکھے جاتے تھے وہ تمام کے تمام بڑی حوصلہ افزا اور پر امید ہوا کرتے تھے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں میری ہمت بڑھاتے تھے۔ میں اور محمد بن عبدالوہاب نے جس راتے کا تعین کیا تھا ہم اسے بڑی تیزی سے طے کر رہے تھے۔ میں سفر و حضر میں کبھی اس کو تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میں آزاد خیالی اور مذہبی عقائد میں جدت پسندی کی روح کو اس کے وجود میں استحکام بخشوں۔ میں ہمیشہ اس کو یہ آس دلاتا رہتا تھا کہ ایک تابناک مستقبل تمہارے انتظار میں ہے۔

ایک دن میں نے اس سے اپنا ایک جھوٹا خواب بیان کیا اور کہا: رات میں نے جناب خاتمی مرتبت رحمۃ اللہ علیہ کو بالکل اسی سر اپا کے ساتھ کرسی پر بیٹھے دیکھا جیسے ذاکر اور واعظین منبروں پر بیان کرتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے علماء اور بزرگان دین نے جن سے میری کوئی واقفیت نہیں تھی چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا تھا۔ ایسے میں، میں نے دیکھا کہ اچانک تم اس مجمع میں داخل ہو گئے۔ تمہارے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ جب تم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پہنچے تو انہوں نے کھڑے ہو کر تمہاری تعظیم کی اور پوچھا اور کہا: "ابے میرے ہمنام محمد بن عبدالوہاب تم میرے علم کے وارث اور مسلمانوں کے رہنما اور دنیاوی امور کو سنوارنے میں میرے جانشین ہو۔"

میں نے کہا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر اپنے علم کا ظاہر کرتے ہوئے مجھے



جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: خوف کو اپنے دل میں جگہ نہ دو کیونکہ جو کچھ تم اپنے بارے میں سوچتے ہو، اس سے کہیں زیادہ صاحب مرتبہ ہو۔ محمد بن عبدالوہاب نے میرے اس من گھڑت خواب کو سنا تو خوشی سے پھولا نہ سلایا۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتا تھا کیا تمہارے خواب سچے ہوتے ہیں؟ اور میں مسلسل اطمینان دلاتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ خواب کے تذکرے کے ساتھ ہی اس نے اپنے دل میں نئے مذہب کے اعلان کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔



اس دوران مجھے لندن سے خط پہنچا کہ میں فوراً کر بلا اور نجف کے مقدس شہروں کی طرف روانہ ہو جاؤں جو شیعوں کے لئے قبلہ آرزو اور علم و روحانیت کے مراکز ہیں۔ اب سب سے پہلے میں مقدمہ کے طور پر ان دونوں مقدس شہروں کا ایک نہایت مختصر منظر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اہل تشیع کے پہلے امام اور عامتہ المسلمین کے چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تدفین شہر نجف کی اہمیت کا سر لوحہ آغاز ہے اور یہیں سے اس بستی کا وجود عمل میں آتا ہے اور یہ روز بروز پھیلتی چلی جاتی ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت مرکز خلافت یعنی کوفہ سے نجف کا فاصلہ چھ گلو میٹر تھا جسے بعد میں ایک گھنٹے میں طے کیا جاسکتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جناب حسین علیہم السلام آپ رضی اللہ عنہ کے جنازے کو پوشیدہ طور پر اس دور افتادہ علاقہ میں لائے جسے آج نجف کہا جاتا ہے اور رات کی تاریکی میں آپ کو دفن کر دیا۔ اب یہ شہر بین النہرین کا سب سے بڑا علاقہ کہلاتا ہے اور اس کی آبادی کوفہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس جگہ اہل تشیع کا حوزہ علمیہ قائم ہے اور دنیا بھر کے علماء نے اس شہر میں بسیرا اختیار کیا ہے۔ ہر سال اس کے بازاروں، مدرسوں اور گھروں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شیعہ علماء خصوصی احترام کے حامل ہیں۔ استنبول میں مقیم عثمانی خلیفہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔

(۱) ایران کا بادشاہ شیعہ مذہب کا پیروکار تھا اور علمائے نجف کی نسبت عثمانی سلاطین کا احترام ایران اور ترکی کے دوستانہ روابط میں استحکام کا باعث تھا اور اس طرح دونوں ممالک میں جنگ کا کھٹکا ختم ہو جاتا تھا۔

(۲) نجف کے اطراف و اکناف میں بہت سے قبائل آباد تھے جو سب کے سب مسلح اور سختی سے شیعہ مراجع کے پیروکار تھے۔ ان کے پاس فوجی اسلحہ اور فوجی تربیت نہیں تھی۔ یہ لوگ قبائلی زندگی کے عادی تھے لیکن علماء کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے لہذا اگر عثمانیوں کی طرف علماء کی بے احترامی عمل میں آتی تو وہ سب کے سب عثمانیوں کے خلاف متحد ہو جاتے اور یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی کہ استنبول کی خلافت ایسا خطرہ اپنے لیے مول لیتی۔

(۳) ہماری دنیائے تشیع میں شیعہ علماء کی مرہمیت قائم تھی لہذا اگر عثمانیوں کی طرف سے زرہ برابر بھی ان کی اہانت ہوتی تو ایران، ہندوستان، افریقہ کے تمام ممالک کے شیعہ برا فروختہ ہوتے اور یہ بات ترک حکومت کے حق میں نہ تھی۔

اہل تشیع کا دوسرا مقدس شہر کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ شہر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فرزند حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آج تک مسلسل پھیل رہا ہے۔ عراق کے لوگوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو دعوت دی کہ آپ شریف لائیں لیکن جو نبی آپ اپنے خاندان کے ساتھ کربلا معلیٰ پہنچے جو کوفہ سے تقریباً ۷۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے عراق کے لوگوں کا مزاج بدل گیا اور وہ یزید کے حکم پر امام کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

یہ سب باتیں صحیح ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حکومت تھی۔ اموی لشکر، حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عراق کی سب کو شہید کر دیا گیا۔ عراقیوں کی

یہ بزدلی اور یزیدی لشکر کی پلیدی اور سنگدلی اسلامی تاریخ کی سب سے زیادہ شرمناک داستان ہے۔ اس واقعے کے بعد آج تک دنیا کے تمام شیعہ کربلا کو زیارت، عبادت، روحانی لگاؤ اور توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور ہر طرف سے جوق در جوق وہاں پہنچتے ہیں۔ کبھی اتنا مجمع ہوتا ہے کہ تاریخ مسیحیت میں بھی کبھی ایسا اجتماع دیکھنے میں نہیں آیا۔ کربلا کے شہر میں بھی شیعہ علماء اور مراجع دین اسلام کی تعلیم و ترویج میں ہمیشہ مصروف نظر آتے ہیں۔ یہاں کے دینی مدرسے طالب علموں سے بھرے رہتے ہیں۔ کربلا اور نجف بالکل ایک دوسرے کی مماثل ہیں۔ دجلہ و فرات عراق کے دو بڑے دریا ہیں جن کا سرچشمہ ترکی کا ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ بین النہرین کی کھیتیاں اسی کے دم سے آباد ہیں اور یہاں کے لوگوں کی خوشحالی انہیں دریاؤں کی مرہون منت ہے۔

جب میں لندن واپس گیا تو میں نے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو یہ پیشکش کی کہ وہ حکومت عراق کو اپنا فرمانبردار بنانے کے لئے دجلہ و فرات کے سنگم کو کنٹرول کرے اور شورش اور بغاوت کے موقعوں پر اس کے راستے تبدیل کرے تاکہ وہاں کے لوگ انگریزوں کے استعماری مقاصد کو ماننے پر مجبور ہو جائیں۔

میں ایک بربری سوداگر کے بھیس میں نجف پہنچا اور وہاں کے شیعہ علماء سے رسموراء بڑھانے کے لئی ان کی درسی مجلسوں اور مباحثہ کی محفلوں میں شرکت کرنے لگا۔ مجلسیں بیشتر اوقات مجھے اپنے اندر جذب کر لیتی تھیں کیونکہ ان میں قلب و ضمیر کی پاکی حکم فرماتی تھی۔ میں نے شیعہ علماء کو انتہائی پاک دامن اور پرہیزگار پایا لیکن افسوس کہ ان میں زمانے کی تبدیلی کے اثرات کا فقدان تھا اور دنیا کے انقلابات نے ان کی فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

(۱) نجف کے علماء اور مراجع عثمانی حکام کے شدید مخالف تھے اس لئے نہیں کہ وہ سنی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ظالم تھے اور عوام ان سے ناخوش تھے اور اپنی نجات کے لئے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

(۲) وہ لوگ اپنا تمام وقت درس و تدریس اور دینی علوم و مباحث پر صرف کرتے تھے اور قرون وسطیٰ کے پادریوں کی طرح انہیں جدید علوم سے دلچسپی نہیں تھی اور اگر کچھ جانتے بھی تھے تو وہ ان کے لئے نہ جاننے کے برابر تھا۔

(۳) انہیں دنیا کے سیاسی واقعات کا قطعاً علم نہ تھا اور اس قسم کے مسائل پر سوچنا ان کے نزدیک بالکل عبث اور بیہودہ تھا۔ انہیں دیکھ کر میں آپ ہی آپ کہتا تھا: واقعی یہ لوگ کتنے بد بخت ہیں۔ دنیا جاگ چکی ہے مگر یہ ابھی خواب خرگوش ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ شاید کوئی تباہ موج فوج ہی ان کو اس خواب گراں سے بیدار کرے۔ میں نے بعض علماء سے خلافت عثمانیہ کے خلاف تحریک چلانے پر گفتگو کی لیکن انہوں نے اپنی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس قسم کے مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ بعض لوگ میرا مذاق اڑاتے تھے اور میری بات کا یہ مفہوم نکالتے تھے کہ میں دنیا کے حالات کو دگرگوں اور نظام عالم کو براہم کرنا چاہتا ہوں۔ ان علماء کی نظر میں خلافت مقدور و محتوم تھی۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ انہیں ظہور مہندی موعود سے پہلے آل عثمان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرنا چاہئے۔ مہدی موعود شیعوں کے بارہویں امام ہیں جو بچپن ہی میں پردہ غیب میں چلے گئے ہیں اور ابھی تک زندہ ہیں۔ آخری زمانے میں ان کا ظہور ہوگا اور وہ اس وقت دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جب وہ مکمل طور پر ظلم و زیادتی سے بھر چکی ہوگی۔

میں اس طرح کا عقیدہ رکھنے والے اسلامی دانشمندیوں کے بارے میں سخت حیران تھا۔ ان کا عقیدہ بعینہ قشری عیسائیوں کا عقیدہ تھا جو قیام عدل کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بازگشت کے قائل تھے۔ میں نے ایک عالم سے پوچھا: کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس ظلم و زیادتی کی خلافت موعود آ رہی ہو کر دنیا میں اسلام کا بولن بالا کیا جائے؟ بالکل نہیں۔ مگر ان علماء (علیہ السلام) نے عالموں کی خلافت جہاں کیا تھا؟

انہوں نے فرمایا: پیغمبر اکرم (ﷺ) کو خدا نے اسی کام کے لئے مامور کیا تھا اور اسی لئے ان میں اس کام کو انجام دینے کی توانائی تھی۔

میں نے کہا: کیا قرآن یہ نہیں کہتا: ”اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہارا مددگار ہوگا“ (ان تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ) (سورۃ محمد - آیت ۷)۔ لہذا تم بھی اللہ کی طرف سے ظالموں کے خلاف تلوار اٹھانے پر مامور ہوئے

آخر کار زچ ہو کر اس نے کہا: ”تم ایک تجارت پیشہ آدمی ہو اور ان موضوعات پر گفتگو کے لئے ایک سلسلہ علم کی ضرورت ہے جس کے لئے تم مناسب نہیں ہو“۔

اب ذرا نجف کی طرف آئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روضہ کے بارے میں گفتگو کریں۔ بڑی پرشکوہ اور با عظمت آرامگاہ ہے۔ پوری عمارت ضاعی، نقاشی، آئینہ کاری اور مختلف سجاوٹوں کا بے مثال شاہکار ہے۔ اطراف مزار بڑے بڑے پرشکوہ کمرے، طلائی ناب کا عظیم گنبد اور سونے کے دو مینار ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔ شیعہ حضرات ہر روز گروہ درگروہ روضہ کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور وہاں کی نماز جماعت میں شرکت کرتے ہیں۔ وہ لوگ بڑے والہانہ انداز میں اخلاق و ارادت کا مجسمہ بن کر ضریح کو بوسہ دیتے ہیں۔ داخلہ سے پہلے عاشقان امام دروازے پر خود کو گرا دیتے ہیں اور بڑے احترام سے بارگاہ کی زمین کو چومتے ہیں۔ پھر امام علی رضی اللہ عنہ پر درود بھیجتے ہیں اور اذن و خول پر چڑھ کر حرم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ حرم کے چاروں طرف ایک عظیم الشان صحن ہے جس میں بہت سے کمرے بنے ہوئے ہیں جو علمائے دین اور زائرین حرم کی اقامت گاہ ہیں۔ کربلائے معلیٰ میں دو مشہور آرامگاہیں ہیں جو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ نجف میں واقع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آرامگاہ کے طرز پر بنائی گئی ہیں۔ پہلی آرامگاہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی اور دوسری حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ہے۔ کربلا کے زائرین بھی



نجف کی طرح روزانہ حرم میں حاضری دیتے ہیں۔ اور امام کی زیارت کرتے ہیں۔ کربلا مجموعی طور نجف سے زیادہ خوش منظر ہے۔ چاروں طرف ہرے بھرے خوشنما باغات اور ان کے درمیان دریا کے بہتے پانی نے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

ان شہروں کی ویرانی اور آشفته حالی نے ہماری کامیابی کے مواقع فراہم کر رکھے تھے۔ لوگوں کی حالت زار دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ عثمانی حکام نے ان شہروں کے رہنے والوں کے ساتھ کن کن جرائم کا ارتکاب کیا اور کیسی کیسی زیادتیاں کیں۔ یہ لوگ بڑے نادان، لالچی، اور خود سر تھے اور جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عراق کے لوگ ان کے زر خرید غلام ہیں۔ پوری قوم حکومت سے نالاں تھی اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شیعہ حضرات اپنی آزادی چھن جانے کے باوجود حکام کے ظلم و ستم کو صبر و سکون کے ساتھ سہہ رہے تھے اور کوئی رد عمل ظاہر نہیں کر رہے تھے، اہل سنت حضرات کا بھی یہی حال تھا۔ وہ لوگ اپنی سر زمین پر ترک گورنر کے تسلط سے بہت ناخوش تھے خاص طور پر جبکہ انکی رگوں میں عرب اشرافیت کا خون دوڑ رہا تھا۔ ادھر خاندان رسالت سے وابستگی رکھنے والے افراد حکومتی انتظامات میں اپنے آپ کو عثمانی گورنر سے زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔

تمام بستیاں ویران تھیں۔ گردوغبار بستی والوں کا مقدور بن چکا تھا۔ ہر طرف بد نظمی کا دور دورہ تھا۔ راستوں پر لٹیرے قابض تھے اور اس تاک میں بیٹھے رہتے تھے کہ حکومت کی سرپرستی سے آزاد کوئی قافلہ ہاں سے گزرے اور وہ انہیں لوٹنا شروع کر دیں لہذا بڑے بڑے قافلے صرف اسی وقت منزل مقصود تک پہنچ سکتے تھے جب انہیں مسلح آدمیوں کے ذریعے حکومت کی حمایت حاصل ہو۔ دوسری طرف قبائلی جھڑپوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جس میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر حملہ آور نہ ہو اور قتل و غارتگری کا بازار گرم نہ ہوتا ہو۔ روزانہ کئی افراد موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے نادانی اور بے علمی نے

پورے عراق کو عجیب طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ واقعات قرون وسطیٰ میں پادریوں کے دور کی یاد تازہ کر رہی تھے۔ صرف نجف اور کربلا کے علماء اس سے متشٹی تھے یا پھر کسی قدر طالب علم یا وہ لوگ جس کا ان علماء سے میل جول تھا وگرنہ سب کے سب جاہل تھے۔ ملکی اقتصاد کا پہیہ جام ہو گیا تھا اور بیماری، بیروزگاری، جہالت اور بد بختیوں نے شدت سے متوسط لوگوں کو گھر دیکھ لیا تھا۔ مملکت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ پاتا تھا حکومت اور عوام کے درمیان مفاہمت کی کمی تھی اور وہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں تھا۔ علمائے دین، مسائل میں اس طرح غرق تھی۔ کہ دنیا کی زندگی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ زمین خشک اور کھیتیاں اجاڑ تھیں۔ دجلہ و فرات کے دونوں دریا کھیتوں کو سیراب کرنے کی بجائے ایک آشفٹہ سر مہمان کی طرح پیاسی زمینوں کے بیچ سے سرعت گزر رہے تھے۔ ملک کی یہ آشفٹہ حالی یقیناً ایک انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔

مختصر یہ کہ میں نے کربلا اور نجف میں چار مہینے گزارے۔ نجف میں، میں ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوا کہ جینے کی آس ٹوٹ گئی۔ تین ہفتے تک میری حالت بہت بری ہو گئی۔ آخر کار مجھے شہر کے ایک ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ اس نے میرے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں جن کے استعمال سے میں بتدریج بہتر ہوتا چلا گیا۔ اس سال گرمی بھی بڑی شدید اور ناقابل برداشت تھی اور میں نے اپنی بیماری کا تمام وقت ایک تہہ خانے میں گزارا جو کسی قدر پرسکون اور ٹھنڈا تھا۔

میرا مالک مکان میرے دیے ہوئے مختصر پیسے سے میرے لیے دوا وارو اور کھانے پینے کا انتظام کرتا تھا۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لواذوں کی خدمت کو قریب الہی کا ڈریجہ سمجھتا تھا۔ بیماری کے ابتدائی دنوں میں میری غذا مرغ کا سلوٹ تھا لیکن بعد میں ڈاکٹر کی اجازت سے میں نے گوشت اور پھول بھی استعمال کرنا شروع کیا اور بیماری سے کسی



تھا کہ کہیں میری محنت اکارت نہ جائے اور جس خواہش کو میں ایک عرصہ سے اپنے سینے میں لیے پھر رہا تھا اس پر پانی نہ پھر جائے۔

جس دن میں بصرہ کی سمت روانہ ہو رہا تھا وہ ترکی جانے پر بھند تھا کہ وہاں جا کر اس شہر کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ میں نے بڑی سختی سے اسے اس سفر سے باز رکھا اور کہا مجھے ڈر ہے کہ تم وہاں جا کر کوئی ایسی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھو جس سے تم پر کفر والحاد کا الزام عائد ہو اور تمہارا خون رائیگاں جائے لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں جا کر وہ بعض علمائے اہلسنت سے کوئی رابطہ قائم کرے کیونکہ اس میں اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ اپنی محکم دلیلوں کے ذریعے دوبارہ اسے اپنے جال میں نہ پھانس لیں اور میرے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔

جب میں نے دیکھا محمد بن عبدالوہاب نجدی بصرہ جانے پر مصر ہے تو مجبوراً میں نے اسے ایران جانے پر ابھارا کہ وہاں جا کر وہ شیراز اور اصفہان کی سیر کرے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان دونوں شہروں کے رہنے والے شیعہ مذہب کے پیروکار ہیں اور یہ بات بعید از قیاس تھی کہ شیخ ان کے عقائد سے متاثر ہو۔ مجھے اس بارے میں پورا اطمینان تھا کیونکہ میں شیخ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ رخصت کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا: ”تقیہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے کہا ”درست ہے کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے ایک صحابی عمار، ان مشرکین کے ڈر سے جنہوں نے ان کے ماں باپ کو قتل کر دیا تھا اپنے آپ کو مشرک ظاہر کرتے رہے اور ختمی مرتبت ﷺ نے جناب عمار یا سر رضی اللہ عنہ کی اس روش کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔“

میں نے اس سے کہا، ”بس تم پر بھی واجب ہے کہ ایران جا کر تقیہ کو نہ بھولو اور اپنے آپ کو خالص شیعہ ظاہر کرو تا کہ اعتراضات سے بچے رہو اور علماء کی صحبت بھی تمہیں حاصل

رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایرانیوں کے آداب و رسوم بھی تم پر کھل جائیں کیونکہ آئندہ چل کر یہ معلومات تمہارے بہت کام آئیں گی اور تمہیں اپنے مقاصد میں بڑی کامیابی عطا کریں گی۔

اس گفتگو کے بعد میں نے اسے کچھ رقم ”زکوٰۃ“ کے عنوان سے دی۔ زکوٰۃ ایک طرح کا اسلامی ٹیکس ہے جسے سرمایہ داروں سے وصول کیا جاتا ہے تاکہ اس آمدنی کو امت کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے۔ جاتے ہوئے میں نے راستے ہی میں اسے ایک گھوڑا خرید کر دیا کیونکہ اسے اس کی سخت ضرورت تھی اور پھر میں اس سے الگ ہو گیا اور اس دن سے اب تک اس کی کوئی خبر نہیں ہے اور نہیں معلوم کہ اس پر کیا بتی ہوگی۔ مجھے زیادہ تشویش اس لیے بھی تھی کہ ہم نے بصرہ سے نکلنے وقت یہ طے کیا تھا کہ ہمیں واپس بصرہ ہی پہنچنا ہے اور اگر ہم میں سے کوئی وہاں نہ پہنچ سکے تو اپنی کیفیت ”عبدالرضا ترکھان“ کو لکھ بھیجے تاکہ دوسرا اس سے باخبر ہو مگر ابھی تک اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

کچھ عرصہ انتظار کے بعد بالآخر آبادیاتی علاقوں کی وزارت سے ضروری احکامات بغداد پہنچے اور میری حکومت نے مجھے فوری طور پر طلب کیا۔ لندن پہنچتے ہی نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری اور علی عہدیداروں کے ساتھ ہم نے ایک کمیشن تشکیل دیا۔ میں نے اس جلسہ میں اپنے فرائض، اقدامات اور مطالعات پر مبنی رپورٹ کو لندن حکام کے سامنے پیش کیا اور انہیں بین النہرین کی کیفیت سے بھی آگاہ کیا۔

عراق سے متعلق میری فراہم کردہ معلومات اور میری کارگزاریوں نے سب کے دل جیت لیے تھے۔ پہلے بھی عراق سے میں نے کئی رپورٹیں ان کے لیے روانہ کیں تھیں۔ اور ان سب سے وہ مطمئن تھے۔ ادھر خلیفہ نے بھی ایک رپورٹ بھیجی تھی جو پوری طرح میری معلومات کی تائید کرتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وزارت خانہ نے میری رپورٹوں کو دیکھ کر انہیں ان کے اپنے لگا رکھے تھے جو سفر و حضر میں بھی پر نگاہ رکھتے



تھے۔ ان افراد نے بھی اپنی رپورٹوں میں میرے طرز عمل اور دلچسپی سے رضائیت کا اظہار کیا تھا۔ اور ان رپورٹوں کی تصدیق کی تھی جو میں نے لندن بھیجیں تھیں۔ اس مرتبہ کلی طور پر میدان میرے ہاتھ میں تھا۔ اور سب مجھ سے خوش تھے۔ یہاں تک کہ اس دور کے سیکرٹری نے وزیر سے میری ملاقات کے لیے وقت لیا اور میں اس کے ساتھ وزیر سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وزیر کے چہرے پر ایک گونہ شگفتگی آگئی اور بڑے پرتپاک انداز میں خوش آمدید کہتے ہوئے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ ملاقات گزشتہ کی بے جان ملاقاتوں سے یکسر مختلف تھی جو اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ میں نے اس کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لی ہے۔

وزیر خاص طور میری اس مہارت کا معترف تھا جس کی بنیاد پر میں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے اپنی گفتگو کے دوران مجھ سے کہا تھا: ”محمد بن عبدالوہاب پر تسلط نوآبادیاتی وزارت کا سب سے اہم مسئلہ تھا۔“ اس نے بڑی شدت سے یہ تاکید کی تھی کہ میں محمد بن عبدالوہاب کو ایک معظم منصوبے کے تحت ان امور سے آگاہ کروں جنہیں آئندہ چل کر اسے ہمارے لیے انجام دینا ہے۔ وہ بار بار اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ عظیم برطانیہ کے لیے میری تمام خدمات شیخ محمد بن عبدالوہاب جیسے شخص کی جستجو اور اس پر اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کے مقابلے میں پاسنگ بھی نہیں۔ نوآبادیاتی علاقوں کے وزیر کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں محمد بن عبدالوہاب کی گمشدگی کے بارے میں بڑا پریشان ہوں تو اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جو کچھ شیخ کو پڑھایا تھا وہ ابھی تک اسے یاد ہے اور ہمارے آدمی اصفہان میں اس سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابھی تک اپنی ڈگر پر قائم ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: شیخ نے اپنے اس غرور و نخوت کے ساتھ انگریز جاسوس کو کیونکر اجازت دی ہوگی کہ وہ اس بات کے بارے میں معلومات

فراہم کر سکیں۔ اس موضوع پر وزیر سے بات چیت کرتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوا کہ کہیں وہ برائے مان جائے۔ بعد میں شیخ سے دوبارہ ملاقات پر مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اور اس نے تمام ماجرہ کہہ سنایا۔ اس نے بتایا کہ اصفہان میں اس کی دوستی عبدالکریم نامی ایک شخص سے ہوئی جو اپنے آپ کو اہل قلم ظاہر کرتا تھا اور اس نے شیخ پر اپنا سکہ بٹھا کر اس کے تمام راز معلوم کر لیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صفیہ بھی کچھ عرصے بعد اصفہان آئی اور اس نے مزید دو مہینے کے لیے شیخ سے متعہ کیا۔ شیراز کے سفر میں وہ اس کے ساتھ نہیں تھی بلکہ عبدالکریم نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ شیراز میں عبدالکریم نے شیخ کے لیے صفیہ سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی کا انتظام کیا تھا اور وہ شیراز کے ایک یہودی خاندان کی حسین و جمیل لڑکی تھی جس کا نام آسیہ تھا۔ عبدالکریم اصفہان کے ایک مادر پدر آزاد عیسائی کا ایک رضی نام تھا اور وہ بھی آسیہ کی طرح ایران میں برطانیہ نوکی آبادیاتی علاقوں کی وزارت کا ایک قدیم ملازم تھا۔

مختصر یہ کہ عبدالکریم، صفیہ، آسیہ اور میں نے مل کر اپنی رات دن کی کوششوں سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کی خواہشات کے عین مطابق ڈھالا اور آئندہ کی پلاننگ کو رو بہ عمل لانے کی ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ کیا۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ وزیر سے ملاقات کے موقع پر سیکرٹری کے علاوہ وزارت کے دو اعلیٰ عہدیدار بھی وہاں موجود تھے۔ جنہیں اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا۔ وزیر نے اجلاس کے اختتام پر مجھ سے کہا: "اب تم انگلستان کی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سب سے بڑے افتخاری افسانے کے حق دار ہو اور وہ اعزاز یہ ہے جسے ہماری حکومت صرف اول کے جاسوس کو دیا کرتی ہے۔" وہ اپنی برائے قلمی انداز میں کہا: "میں نے سیکرٹری سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہیں کسی ایک شخص کے لئے "ہشیرا" اور "راز دارانہ" مسائل سے آگاہ کرے تاکہ تم اپنی ذمہ داریوں کو سرانجام دے سکو۔"

وزیر کی خوشنودی کے سبب میری دس دن کی چھٹی منظور ہوئی اور مجھے اپنی بیوی اور ایک عدد بچے سے ملنے کا موقع ملا۔ میرا لڑکا جو اب تین سال کا ہو چکا تھا، بالکل میرا ہم شکل تھا اور بعض الفاظ بڑے بیٹھے انداز میں بولنے لگا تھا۔ اس نے چلنا بھی سیکھ لیا تھا۔ میں حقیقتاً اپنے دل کے ٹکڑے کو زمین پر چلتا پھرتا محسوس کر رہا تھا۔ افسوس کہ خوشی کے یہ لمحات بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ بیوی اور بچے کے، ساتھ گزرنے والے لمحات واقعی ناقابل بیان ہیں۔ اور زندگی کی تمام لذتیں اس کے آگے بچھ ہیں۔ میری ایک عمر رسیدہ چچی تھی جس کی مجھ پر بچپن ہی سے نوازشات اور مہربانیاں رہی ہیں۔ میں اس سے مل کر کس قدر خوش ہوا، اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔ میری اس سے یہ آخری ملاقات تھی اس لیے کہ دس دن کی چھٹیوں کے بعد جب میں تیسری مرتبہ اپنے سفر پر روانہ ہوا تو نہایت افسوس کے ساتھ مجھے اس کی موت کی اطلاع ملی۔

میری دس دن کی یہ چھٹیاں پلک جھپکتے گزر گئیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ زندگی کے پرمسرت لمحات ہمیشہ بڑی تیزی سے گزرتے ہیں اور مصیبت کی گھڑیاں اپنے دامن میں سالوں کا فاصلہ رکھتی ہیں۔ لندن کے پرمسرت لمحات میں، میں نے اپنی نجف کی بیماری کو یاد کیا جس کا ہر لمحہ میرے لئے ایک صدی بن گیا تھا۔ میں کسی طرح بھی مصیبت کے ان ایام کو بھلا نہیں سکتا۔ خوشی کے لمحات کو اتنا دوام نہیں کہ وہ مصائب کے دنوں کی کوفت کو یادوں کے درپچوں میں نہ آنے دیں۔ دس دن کی چھٹیاں منانے کے بعد آئندہ کے لائحہ عمل سے باخبر ہونے کے لئے بادل نخواستہ وزارت خزانہ گیا۔ سیکرٹری سے ملاقات کے موقع پر میں نے اسے ہمیشہ کی طرح خوش و خرم پایا۔ اس نے مجھ سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور دوستانہ لہجہ میں کہا:

نوآبادیاتی امور کے خصوصی کمیشن کی مرضی کے مطابق روز پر نے خود مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں دو ماہ ریمونڈ سے آشنا کروں۔ ان ریمونڈ سے واقفیت آئندہ کے پروگراموں

میں تمہارے لئے بہت مفید ثابت ہوگی اور ان دو باتوں سے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے صرف چند ایک ممبران ہی باخبر ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنے ساتھ وزارت خانہ کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں کچھ لوگ ایک گول میز کے اطراف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر تعجب سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

وزیر کے ساتھ میں جس کمرے میں گیا وہاں موجود افراد کی کیفیت کچھ یوں تھی کہ:

(۱) ہو بہو سلطنت عثمانی کا جلالت افروز پیکر جوتر کی اور انگریزی زبانوں پر بڑی مہارت سے مسلط تھا۔

(۲) قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام کی دوسری حقیقت سے قریب تصویر۔

(۳) شہنشاہ ایران کا زندہ مجسمہ۔

(۴) دربار ایران کے شیعہ عالم کی مکمل شبیہ۔

(۵) نجف میں شیعوں کے مرجع کا بے مثل سراپا۔

یہ آخری تین افراد فارسی اور انگریزی زبانوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ سب کے

نزدیک ان کے پرائیویٹ سیکرٹری براجمان تھے جو ان کی باتوں کا نوٹ بنا کر حاضرین کے

لیے اس کا ترجمہ پیش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام پرائیویٹ سیکرٹریوں کا کسی زمانے

میں مذکورہ پانچ شخصیتوں سے بہت قریب کا رابطہ رہ چکا تھا اور ان کی مکمل رپورٹ کے تحت

ان پانچ ہم شبیہ افراد کو عینہ تمام عادات و خصائل کے ساتھ ظاہری و باطنی اعتبار سے اصلی

افراد کی مکمل تصویر بنایا گیا تھا۔ یہ پانچوں سوانگی اپنے فرائض اور مقام و منصب سے بخوبی

آشنا تھے۔ سیکرٹری نے آغاز سخن کرتے ہوئے کہا: ان پانچ افراد نے اصلی شخصیتوں کو

سروپ بھر رکھا ہے اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کس طرح کی سوچ رکھتے ہیں اور آئندہ کے

تعمیرات میں ان کا کیا خیال ہے۔ ہم نے استنبول، تہران اور نجف کی مکمل اطلاعات انہیں

فراہم کر دی ہیں۔ اب وہ اپنی ہیئت کذائی کو حقیقت پر محمول کیے بیٹھے ہیں اور اسی احساس کے ساتھ اپنی حاصل کردہ معلومات سے ہمارے سوالات کو جواب فراہم کرتے ہیں۔ ہماری جانچ پڑتال کے مطابق ان کے ستر فیصد جوابات حقیقت کے عین مطابق یا یوں کہیے کہ اصلی شخصیتوں کے افکار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ سیکرٹری نے اپنی گفتگو کے دوران مجھے مخاطب کر کے کہا: ”اگر تم چاہو تو اس میں کسی کا امتحان لے سکتے ہو۔ مثال کے طور پر نجف کے شیعہ مرجع تقلید سے جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔“

میں نے کہا بہت اچھا اور فوراً ہی کچھ سوالات پوچھ ڈالے۔

میرا پہلا سوال یہ تھا: ”قبلہ و عقبہ! کیا آپ اپنے مقلدین کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ سنی عثمانی حکومت کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں اور ان کے خلاف اعلان جنگ کریں؟“ نقلی سوئی مرجع تقلید نے کچھ دیر سوچا اور کہا: ”میں مطلق جنگ کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ وہ سنی مسلمان ہیں اور قرآن کی آیت کہتی ہے کہ ”تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں“ صرف اس صورت میں جنگ جائز ہے جب عثمانی حکمران ظلم و ستم پزیر آئیں۔ ایسی حالت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تحت ان سے جنگ لڑی جاسکتی ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب آثار ظلم زائل نہ ہو جائیں اور ظالم ظلم سے باز نہ آجائے۔“

میں نے پھر دوسرا سوال پوچھا: ”حضور والا! یہودیوں اور عیسائیوں کی نجاست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ لوگ واقعی ناپاک ہیں؟“ اس نے کہا: ”ہاں، یہ دونوں فرقے مسلمانوں میں ہیں اور مسلمانوں کو ان سے دور رہنا چاہیے۔“

میں نے پوچھا: ”اس کی کیا وجہ ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”یہ دراصل مساویانہ سلوک کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ لوگ بھی ہمیں کافر گردانتے ہیں اور ہمارے عقیدوں کی تکذیب کرتے ہیں۔“



اس کے بعد میں نے پوچھا: ”پیغمبر اکرم ﷺ کی صفائی سے متعلق اتنی تاکیدات کے بعد صفائی ایمان کی علامت ہے، پھر کیوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحن مطہر اور تمام بازاروں میں اس قدر گندگی پھیلی رہتی ہے؟“

مرجع تقلید نے جواب دیا: ”بے شک اسلام نے صفائی اور ستھرائی کو ایمان کی دلیل جانا ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ عثمانی حکومت کے اعمال کی بے توجہ اور پانی کی قلت نے یہ صورت پیدا کی ہے۔“

دلچسپ بات یہ تھی کہ اس بناوٹی مرجع تقلید کی آمادگی اور حاضر جوابی نجف کے حقیقی مرجع تقلید کے عین مطابق تھی۔ فقط عثمانی حکومت کے اعمال کی بے توجہی کی بات اس نے اپنی طرف سے اس میں ملائی تھی کیونکہ نجف کے عالم کی زبان سے یہ جملہ نہیں سنا گیا تھا۔ بہر حال میں اس ہم آہنگی اور مشابہت پر سخت متحیر تھا کیونکہ تمام جوابات بعینہ اصل مرجع تقلید کے بیانات تھے جسے اس نے فارسی میں پیش کیا تھا یہ نقلی مرجع بھی فارسی ہی میں گفتگو کر رہا تھا۔ سیکرٹری نے مجھ سے کہا: ”دیگر چار افراد سے بھی چاہو تو سوال کر سکتے ہو۔ یہ چاروں افراد بھی تمہیں اصلی شخصیتوں کی طرح جواب دیں گے۔“

میں نے کہا کہ میں استنبول کے شیخ الاسلام احمد آفندی کے افکار اور بیانات سے بخوبی واقف ہوں اور اس کی باتیں میرے حافطے میں محفوظ ہیں۔ آپ کی اجازت سے میں اس کی ہم شکل سے گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: آفندی صاحب! کیا عثمانی خلفاء کی اطاعت واجب ہے؟“

اس نے کہا: ”ہاں میرے بیٹے! اس کی اطاعت، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی طرح واجب ہے۔“

اس نے جواب دیا: ”کیا تم نے یہ آیت کریمہ نہیں سنی ہے کہ: ”خدا، اس کے رسول (ﷺ) اور اولی الامر کی اطاعت کرو“۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَ اطِيعُوا الرَّسُولَ أُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ (سورۃ نساء، آیت ۵۹)

میں نے کہا: ”اگر خلیفہ اولی الامر ہے تو گویا خدا نے ہمیں یزید کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے کیونکہ وہ اس وقت کا خلیفہ تھا حالانکہ اس نے مدینے کی تاراجی کا حکم دیا تھا اور سبط رسول ﷺ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا اور خداوندِ علیم کس طرح ولید کی اطاعت کا حکم دے گا جبکہ وہ شراب خور تھا؟“۔ نقلی شیخ الاسلام نے جواب دیا:۔

”میرے بچے! یزید اللہ کی طرف سے مومنوں کا امیر تھا لیکن قتل حسین میں اس سے خطا ہو گئی تھی جس کے لیے بعد میں اس نے توبہ کر لی تھی۔ مدینہ میں قتل و غارتگری کا سبب وہاں کے لوگوں کی سرکشی اور یزید کی اطاعت سے انحراف تھا جس میں یزید کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اب رہ گیا ولید تو اس میں شک نہیں کہ وہ شراب پیتا تھا لیکن شراب میں پانی ملا کر پیتا تھا تا کہ اس کی مستی ختم ہو جائے اور یہ اسلام میں جائز ہے۔“

میں نے کچھ عرصہ قبل استنبول میں حرمت شراب کے متعلق مسئلہ کو وہاں کے شیخ الاسلام شیخ احمد سے دریافت کر لیا تھا۔ اس کا جواب کچھ اختلاف کے ساتھ لندن کے اس نقلی شیخ الاسلام کے جواب سے ملتا جلتا تھا۔ میں نے اصل سے نقل کی ایسی شاہت تیار کرنے کی کوششوں کو سراہتے ہوئے بیکر ٹری سے پوچھا: ”آخر اس کام سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”اس طرہ ہم بادشاہوں اور سنی شیخ علماء کے انکار اور ان کے میلان طبع سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان مکالمات کو پکھا جاتا ہے اور ان سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور پھر ہم علاقے کے دینی اور سیاسی مسائل میں دخل اندازی کرتے ہیں مثلاً اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ غلامانِ عالم یا غلامانِ بادشاہانہ کی شرعی سرحدوں میں

سے مخالفت پر اتر آیا ہے تو ہم اس کو ناکارہ بنانے کے لیے ہر طرف سے اپنی توانائیوں کو اس سمت میں مرکوز کر دیتے ہیں لیکن اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارا حقیقی دشمن کس مقام پر سرگرم عمل ہے تو ہمیں اپنی توانائیوں کو علاقہ کے چپے چپے میں پھیلانا پڑتا ہے۔ مذکورہ عمل ہمیں اس بات میں بھی مدد دیتا ہے کہ ہم اسلام کے احکام و فرامین میں سے ایک فرد مسلم کے طرز استنباط کو سمجھیں اور زیادہ منطقی مطالب فراہم کریں اور اس کے عقائد کو باطل قرار دیں۔ اختلافات، تفرقی، گڑ بڑ اور مسلمانوں کے عقائد میں تزلزل پیدا کرنے کے لیے اسی طرح کے اقدامات بے انتہا مؤثر پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد سیکرٹری نے مجھے ایک ہزار صفحوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مطالعہ کے لیے دی۔ اس کتاب میں اصلی اور نقلی افراد کی گفتگو، تجزیہ اور مقابلوں کے نتائج سے متعلق اعداد و شمار درج تھے اور مجھے حاصل شدہ نتائج کی بنیاد پر اسلامی دنیا میں فوجی، مالی، تعلیمی اور مذہبی مسائل سے متعلق حکومت برطانیہ کے مرتب شدہ پروگراموں سے واقفیت حاصل کرنا تھی۔

بہر حال میں کتاب گمراہ لے گیا اور تین ہفتے کے عرصے میں بڑی توجہ کے ساتھ شروع سے آخر تک اس کا مطالعہ کیا اور مقررہ مدت میں نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت کو واپس دے آیا۔ کتاب واقعی بڑی محنت سے تیار کی گئی تھی۔ اس میں صاحبان علم صاحبان سیاست اور اسلام کی دینی شخصیتوں کے عقائد و نظریات کے بارے میں اس خوبی سے بحث کی گئی تھی اور نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا تھا۔ ستر فیصد مباحث حقیقت پر مبنی تھے جبکہ ۳۰ فیصد میں اختلاف تھا۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ اس حکومت اپنے عمل میں کامیاب ہوگی اور مذکورہ کتاب کی پیشین گوئی کے مطابق حکومت کوئی ایک صدی سے کم عرصہ میں بہر حال ختم ہو جائے گی۔

اس کے بعد مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ نو آبادیاتی علاقوں کی

وزارت میں دنیا کے تمام ممالک کے لیے خواہ وہ استعماری ہوں یا نیم استعماری اس طرح شبیہ سازی یا نقلی روپ کا عمل بروئے کار لایا گیا ہے اور ان تمام ممالک کو پوری طرح استعمار کے شکنجے میں جکڑنے کے انتظامات مکمل کیے گئے ہیں۔

سیکرٹری نے اپنی گفتگو کے دوران مجھ سے کہا تھا کہ وہ پہلا راز ہے جسے اس نے وزیر کے حکم کے مطابق مجھے بتایا ہے مگر دوسرے راز کو وہ مذکورہ کتاب کی دوسری جلد کے مطالعہ پر ایک ماہ بعد مجھے بتائے گا۔

میں نے دوسری کتاب لے کر اس کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ کتاب پہلی کتاب کو مکمل کرتی تھی۔ اس میں اسلامی ممالک سے متعلق نئی اطلاعات زندگی کے مختلف مسائل میں شیعہ سنی عقائد و افکار جو حکومت کی کمزوری یا توانائی کو ظاہر کرتے تھی اور مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب وغیرہ پر گفتگو تھی۔ اس کتاب میں ان موضوعات پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور مسلمانوں کے کمزور پہلوؤں یا طاقت کے ذرائع کو نمایاں کیا گیا تھا اور ان سے اپنے حق میں فائدہ اٹھانے کی تدابیر سمجھائی گئی تھیں۔ اس کتاب میں مسلمانوں کی جن کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ یہ تھیں:

(۱) شیعہ سنی اختلاف

(۲) حکمرانوں کے ساتھ قوموں کے اختلافات

(۳) ایرانی اور عثمانی حکومتوں کے اختلافات

(۴) قبائلی اختلافات

(۵) علماء اور حکومت کے عہدہ داروں کے درمیان غلط فہمیاں

(۶) تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں جہالت اور نادانی کی فراوانی

(۷) فکری جمود اور تعصب، روزانہ کے حالات سے بے خبری، کام اور محنت کی کمی

(۸) مادی زندگی سے بے توجہی، جنت کی امید میں حد سے زیادہ عبادت جو اس دنیا میں بہتر زندگی کے راستوں کو بند کر دیتی تھی۔

(۹) خود سرفرمانواؤں کے ظلم و استبداد۔

(۱۰) امن و امان کا فقدان، شہروں کے درمیان سڑکوں اور راستوں کا فقدان، علاج

معالجے کی سہولتوں اور حفظان صحت کے اصولوں کا فقدان جس کی بنا پر طاعون یا اس جیسی متعدی بیماریوں سے ہر سال آبادی کا ایک حصہ موت کی نذر ہو جاتا ہے۔

(۱۱) حکومتی دفتروں میں بد انتظامی اور قاعدے قوانین کا فقدان، قرآن اور احکام

شریعت کے احترام کے باوجود عملی طور پر اس سے بے توجہی۔

(۱۲) شہروں کی دیرانی، آپاشی کے نظام کا فقدان، زراعت اور کھیتی باڑی کی کمی۔

(۱۳) پس ماندہ اور غیر صحت مندانہ اقتصاد۔ پورے علاقے میں عام غربت اور

بیماری کا دور دورہ۔

(۱۴) صحیح تربیت یافتہ فوجوں کا فقدان، اسلحہ اور دفاعی ساز و سامان کی کمی اور موجودہ

اسلحہ کی فرسودگی۔

(۱۵) عورتوں کی تحقیر اور ان کے حقوق کی پامالی۔

(۱۶) شہروں اور دیہاتوں کی گندگی، ہر طرف کوڑے کرکٹ کے انبار۔

(۱۷) سڑکوں، شاہراہوں اور بازاروں میں اشیائے فروخت کے بکھرے ہوئے

بے حکم ڈبیر وغیرہ۔

مسلمانوں کے گزور پہلوؤں کو گولٹے کے بعد کتاب نے اس حقیقت کی طرف

دھیان دیا تھا کہ شریعت اسلام کا قانون مسلمانوں کی اس طرز زندگی سے رتی برابر میل

مکھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی روح سے بے خبر رکھا



جائے اور انہیں حقائق دین تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ اس کے بعد کتاب نے بصورت فہرست ان اوامر و احکامات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو دین اسلام کے اصول و مہانی کو ظاہر کرتے تھے اور ان کی صورت یہ تھی۔

(۱) وحدت، دوستی اور بھائی چارہ کی تاکید اور تفرقہ سے دوری۔

(۲) تعلیم و تربیت کی تاکید۔

(۳) جستجو اور افکار کی تاکید۔

(۴) مادی زندگی بہتر بنانے کی تاکید۔

(۵) زندگی کے مسائل میں لوگوں سے رائے مشورے کی تاکید۔

(۶) شاہراہیں بنانے کی تاکید۔

(۷) حدیث نبوی کی بنیاد پر سندرستی اور معالجہ کی تاکید۔

علوم کی چار قسمیں:

(۱) علم فقہ، دین کی حفاظت کے لیے۔

(ب) علم طب، بدن کی حفاظت کے لیے۔

(ج) علم نحو، زبان کی حفاظت کے لیے۔

(د) علم نجوم، زمانے کی پہچان کے لیے۔

(۸) آباد کاری کی تاکید۔

(۹) اپنے کاموں میں نظم و ترتیب۔

(۱۰) معاشی استحکام کی تاکید۔

(۱۱) جدید ترین اسلحہ اور جنگی ساز و سامان سے لیس فوجی تنظیم کی تاکید۔

(۱۲) عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے احرام کی تاکید۔

(۱۳) صفائی اور پاکیزگی کی تاکید۔

ان اوامر کے تذکرہ کے بعد کتاب اپنے دوسرے باب میں اسلام کی طاقت و قوت کے سرچشموں کے پیشرفت کے اسباب پر روشنی ڈالتی ہے اور انہیں تباہی سے دوچار کرنے کے لیے ترقی کی راہوں کے خلاف اقدامات کو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا نقطہ آغاز قرار دیتی ہے اور وہ ترقی کی راہیں یہ تھیں:

- (۱) رنگ و نسل، زبان، تہذیب و تمدن اور قومی تعصبات کو خاطر میں نہ لانا۔
- (۲) سود، ذخیرہ اندوزی، بد عملی، شراب اور سود کے گوشت وغیرہ کی ممانعت۔
- (۳) ایمان و عقیدہ کی بنیاد پر علمائے دین سے شدید محبت اور وابستگی۔
- (۴) موجودہ خلیفہ کی نسبت عامۃ المسلمین کا احترام اور یہ عقیدہ کہ وہ پیغمبر کا جانشین اور اولی الامر ہے جس کی بنا پر اس کے احکامات کی بجا آوری خدا اور رسول (ﷺ) کے احکامات کی بجا آوری ہے۔
- (۵) کفار کے خلاف وجوب جہاد۔
- (۶) غیر مسلموں کی ناپاکی پونہی اہل تشیع کا عقیدہ۔
- (۷) مختلف ادیان اور مذاہب پر اسلام کی بالادستی کا اعتقاد۔
- (۸) اسلامی سر زمین پر یہودی اور نصرانی عبادت گاہوں کی تعمیر کے بارے میں شیعہ حضرات کی ممانعت۔
- (۹) جزیرۃ العرب سے تمام یہودیوں اور نصرانیوں کے انخلاء پر اکثر مسلمانوں کا اتفاق۔
- (۱۰) استیاق کے ساتھ نماز، روزہ اور حج کے فرائض کی انجام دہی میں مداومت۔
- (۱۱) فحش کی ادائیگی کے بارے میں اہل تشیع کا عقیدہ اور علماء کی طرف سے مستحقین کو

میں ادا کی گئی۔

میں ادا کی گئی۔

میں ادا کی گئی۔

(۱۳) گھریلو استحکام کے بنیادی مقصد کے ساتھ بچوں اور نوجوانوں کی روایتی تعلیم

و تربیت اور بچوں کے ساتھ والدین کے ذہنی ارتباط کی ضرورت و اہمیت کا رجحان۔

(۱۴) عورتوں کو پردہ کی تاکید جو انہیں غیر شرعی روابط اور بد عملیوں سے روکتی ہے۔

(۱۵) نماز باجماعت کی ادائیگی اور ہر جگہ کے لوگوں کا دن میں کئی مرتبہ ایک مسجد

میں اکٹھا ہونا۔

(۱۶) پیغمبر اکرم، اہل بیت اور علماء کی زیارت گاہوں کی تعظیم اور ان، مقامات کو

ملاقات اور اجتماع کے مراکز قرار دینا۔

(۱۷) سادات کا احترام اور رسول اکرم ﷺ کا اس طرح تذکرہ کرنا گویا وہ ابھی زندہ

ہیں اور درود و سلام کے مستحق ہیں۔

(۱۸) اسلام کے اہم اصولوں کے عنوان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب۔

(۱۹) شادی بیاہ، کثرت اولاد اور تعداد ازواج کا مستحب ہونا۔

(۲۰) کافروں کی ہدایت پر اتنا زور کہ اگر کوئی کسی کافر کو مسلمان کرے تو یہ کام اس کی

لیے تمام دنیا کی دولت سے مفید ہوگا۔

(۲۱) نیک عمل انجام دینے کی اہمیت: ”جو کوئی نیک عمل کی پیروی کرے گا اس کی لیے

وہ جزائیں مخصوص ہیں۔ ایک خود اس نیک عمل کی اپنی جزا اور دوسرے اس نیک

عمل کو انجام دیئے کی جزا“۔

(۲۲) قرآن و حدیث کا بے انتہا پاس و احترام اور ثواب آخرت کے لیے ان پر عمل پیرا

ہونے کی شدید ضرورت۔

اسلام کے ان سرچشمہ ہائے قوت کے تذکرہ کے بعد کتاب کے اگلے ابواب

میں دیانت کے ان محکم ستونوں کو کمزور بنانے کے عملی راستوں پر بڑی محکم ویلیوں کے ساتھ

گفتگو کی گئی تھی۔ اس کے بعد بصورت فہرست ان اقدامات کی تاکید کی گئی تھی جن کے

ذریعے اسلامی دنیا کو کمزور بنایا جاسکتا تھا اور وہ یہ تھیں:

(۱) بدگمانی اور سوء تفہیم کے ذریعے شیعہ اور سنی مسلمانوں میں مذہبی اختلافات پیدا

کرنے اور دونوں گروہوں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف ابانت آمیز

اور تہمت انگیز باتیں لکھنا اور نفاق و تفرقے کے اس سود مند پروگرام کو رو بہ عمل

لانے کے لیے بھاری اخراجات کی ہرگز پروا نہ کرنا۔

(۲) مسلمانوں کو جہالت اور لاعلمی کے عالم میں رکھنا۔ کسی تعلیمی مرکز کے قیام کی

کوشش کو کامیاب نہ ہونے دینا۔ طباعت اور نشر و اشاعت پر پابندی عائد کرنا

اور ضرورت پڑے تو عوامی کتاب خانوں کے نذر آتش کرنا۔ بچوں کو دینی مدارس

میں جانے سے روکنے کے لیے علماء اور مزاج دینی پر ہتھیں لگانا۔

(۳) کابلی پھیلا نے اور زندگی کی جستجو سے مسلمانوں کو محروم کرنے کے لیے موت کے

بعد کی دنیا میں رنگ آمیزی اور جنت کی ایسی توصیف بیان کرنا تا کہ وہ مجسم بن کر

لوگوں کے ذہن و قلب پر چھا جائے اور وہ اس کا حاصل کرنے کے لیے اپنی

معاشی تنگ و دو سے دستبردار ہو جائیں اور ملک الموت کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔

(۴) ہر طرف درویشوں کی خانقاہوں کو پھیلاؤ اور ایسی کتابوں اور رسالوں کی

طباعت جو لوگوں کو دنیا و مافیہا سے برگشتہ کر کے انہیں مردم بیزاری اور گوشہ

نشینی کی طرف مائل کریں جیسے غزالی کی احیاء العلوم، مولانا روم کی مشکوی اور

محل الدین عربی کی کتابیں وغیرہ۔

(ان کتابوں کے بارے میں لکھنے والے کا فیصلہ بے علمی یا بد نیتی پر مبنی ہے۔ غزالی

محل الدین عربی اور مولانا جلال الدین رومی جیسے عرفاء کی بیان کردہ تعلیمات

میں سے ایک سلسلہ ہے۔ نفس کے تزکیہ و تہذیب کو گوشہ نشینی اور مردم بیزاری سے تعبیر

کرنے کا (مردم)

(۵) خود خواہ حکمرانوں کی حقانیت کے ثبوت میں مختلف احادیث کی اشاعت مثلاً:

”بادشاہ زمین پر اللہ کا سایہ ہے۔“ یا پھر یہ دعویٰ کہ حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور علی،

بنی امیہ اور بنی عباس سب کے سب بالجبر تلوار کے زور سے حکومت کے منصب پر

فائز ہوئے اور بزور شمشیر حکمرانی یا سقیہ کی کارروائی کو ایک تماشے کی صورت میں پیش

کرنا جس کی ڈوری حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے تھام رکھی ہو اور اس بارے میں

دلائل قائم کرنا جیسے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے طرف داروں خاص طور پر آپ

کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہ الزہراء (رضی اللہ عنہا) کے گھر جلانا نیز یہ ثابت کرنا کہ:

(۱) حضرت عمر کی خلافت، ظاہراً حضرت ابو بکر کی وصیت اور باطناً مخالفین کو ڈرا دھمکا

کر عمل میں لائی گئی۔

(۲) حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی مخالفت کی بنیاد پر حضرت عثمان کے انتخاب میں

ڈرامائی طور پر شوریٰ کی تشکیل، جو بالآخر مخالفت، شورش، خلیفہ سوم کے قتل اور

حضرت علی کی خلافت پر منج ہوئی۔

(۳) مکرو حیلہ اور شمشیر کے ذریعے معاویہ کا برسرِ اقتدار آنا اور اسی صورت میں اس کی

جانشینوں کا استقرار۔

(۴) ابو مسلم کی قیادت میں سفاح کی مسلح شورش اور بزور شمشیر خلافت بنی عباس کا قیام۔

(۵) حضرت ابو بکر سے لے کر عثمانیوں کی حکمرانی کے اس دور تک تمام خلفائے اسلام

آمر تھے اور یہ کہ:

نظام اسلام میں ہمیشہ آمریت کا دور دورہ رہا ہے۔

(۶) راستوں میں بد امنی کے اسباب فراہم کرنا۔ پداندیش افراد کی مدد سے شہروں

اور دیہاتوں میں فتنہ و فساد برپا کرنا اور غنڈوں و فسادیوں اور ڈاکوؤں کی پشت

پناہی کرنا اور انہیں اسلحہ اور رقم فراہم کر کے ان کی مدد کرنا۔



(۷) حفظانِ صحت کی کوششوں میں آڑے آنا اور جبری اور قدری انکار کو ترجیح دینا

اور یہ بتانا کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ بیماری بھی اللہ کی دین ہے اور اس کا علاج بے سود ہے۔ اس سلسلے میں یہ آیت پیش کرنا ”وہی ہے جو مجھے کھانا دیتا ہے اور پیاس کی حالت میں سیراب کرتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے تندرستی عطا کرتا ہے“۔ (سورۃ شعراء آیت ۸۰) وہی مارتا ہے اور جلاتا بھی ہے۔ (سورۃ شعراء آیت ۸۱) شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ موت اور حیات بھی اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ بیماری سے شفا یابی اور موت سے رہائی اس کی مشیت اور اس کے ارادہ کے بغیر قطعی ناممکن ہے اور یہ تمام رونما ہونے والے واقعات قضائے الہی ہیں۔

(۸) اسلامی ممالک کو فقر و افلاس میں باقی رکھنا اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل یا اصلاح عمل کو جاری نہ ہونے دینا۔

(۹) فتنہ و فساد اور ہنگامہ آرائیوں کو ہوا دینا اور اس عقیدہ کو لوگوں میں راسخ کرنا کہ اسلام محض عبادت اور پرہیزگاری کا نام ہے۔ اور دنیا اور اس کے امور سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ حضرت ختمی المررتبت (ﷺ) اور ان کے جانشینوں نے کبھی ان مسائل میں پڑنے کی کوشش نہیں کی اور سیاسی اور اقتصادی تنظیم سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

(۱۰) ادھر دیے ہوئے امور پر توجہ اقتصادی بد حالی اور غربت و بیکاری میں اضافہ کا باعث ہو

گی مگر اس کے ساتھ ساتھ پسماندگی میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

کسالوں کے غلہ کے ڈھیروں کو نذر آتش کیا جائے، تجارتی کشتیوں کو ڈبو دیا جائے،

عمارتی پہاڑ اور منستی مراکز میں بڑے پیمانے پر آگ بھڑکائی جائے۔ دریاؤں کے

پانی کو زہل سے لیا جائے اور پینے کے پانی کو زہر آلود بنا لیا جائے تاکہ ان

ممالک کی پسماندگی اور فقر و ہلاکت کا سامان فراہم کیا جاسکے۔

(۱۱) اسلامی حکمرانوں کے مزاج کو بدلا جائے اور ان میں شراب نوشی، جوئے بازی اور دیگر اخلاقی برائیاں پیدا کی جائیں۔ قومی خزانہ میں خورد برد اور لوٹ کھسوٹ کی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ ان کے پاس اپنے دفاع، ملکی معیشت اور ترقیاتی امور کے لیے کوئی رقم باقی نہ رہے۔

(۱۲) ”مرد عورتوں پا حاکم ہیں“ (سورۃ نساء آیت ۳۴) یا ”عورتیں بدی کا پتلا ہیں“ کی حدیث کے سہارے عورتوں کی توہین و تحقیر اور کنیزی کا پرچار کیا جائے۔

(۱۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی شہری اور دیہاتی بستیوں میں غلاظت اور گندگی کا سب سے بڑا سبب ان علاقوں میں پانی کی کمی ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم ہر ممکن طریقے سے گنجان آباد علاقوں میں پانی کی فراوانی روک دیں تاکہ ان علاقوں میں زیادہ کثرت سے گندگی میں اضافہ ہو۔

۱۶ کتاب کے ایک اور باب میں مسلمانوں کی قوت و طاقت کو توڑنے اور انہیں کمزور بنانے کے دیگر اصولوں پر بھی گفتگو کی گئی تھی جو دلچسپی سے خالی نہیں:

(۱) ایسے افکار کی ترویج جو قومی، قبائلی اور نسلی عصبیتوں کو ہوا دیں اور لوگوں کو گزشتہ قوموں کی تاریخ، زبان اور ثقافت کی طرف شدت سے مائل کریں اور وہ ماقبل اسلام کی تاریخی شخصیتوں پر فریفتہ ہو جائیں اور ان کا احترام کریں۔ مصر میں فرعونیت کا احیاء، ایران میں زردشت اور بین النہرین میں بابل کی بت پرستی ان ہی کی مثالیں ہیں۔ کتاب کے اس حصے میں ایک بڑے نقشے کا بھی اضافہ کیا گیا تھا جس میں ان مراکز کی نشاندہی کی گئی تھی جن میں سابق الذکر خطوط پر عملدرآمد ہو رہا تھا۔

(۲) شراب خوری، جوئے بازی، بد فعلی اور شہوت رانی کی ترویج، سور کے گوشت کے استعمال کی ترغیب، ان کارگزاروں میں یہودی، نصرانی، زردشتی اور صابئی اقلیتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ بٹانا چاہیے اور ان برائیوں کو

مسلم معاشرے میں زیادہ سے زیادہ فروغ دینا چاہیے جن کے عوض نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت انہیں انعام و اکرام سے نوازے گی۔ اس کام کے لیے متعدد افراد کی ضرورت ہے جو کسی بھی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور شراب، جوا، فحاشی اور سؤر کے گوشت کو جہاں تک ہو سکے لوگوں میں مقبول بنائیں۔ اسلامی دنیا میں انگریزی حکومت کے کارندوں کا یہ فریضہ تھا کہ وہ مال و دولت، انعام و اکرام اور ہر مناسب طریقے سے ان برائیوں کی پشت پناہی کریں اور ان پر عمل پیرا افراد کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچنے دیں اور مسلمانوں کو اسلامی احکامات اور اس کی اوامر و نواہی سے روگردانی کی ترغیب دیں کیونکہ اس کام شرع سے بے توجہی معاشرے میں بد نظمی اور افراتفری کا سبب ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں سود کی شدت سے مذمت کی گئی ہے اور اس کا شمار گناہان کبیرہ میں ہوتا ہے۔ پس لازم ہے کہ ہر حال میں سود اور حرام سودے بازی کو عام کرنے کی کوشش کی جائے اور اقتصادی بد حالی کو مکمل طور پر مضمحل بنایا جائے۔ اس کام کے لیے ضروری ہے کہ سود کی حرمت سے متعلق آیات کی غلط تفسیر کی جائے اور اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ قرآن کے ایک حکم کی سرتابی اسلام کے تمام احکام سے روگردانی کی جرأت کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ قرآن نے جس سود کو منع کیا ہے وہ سود مرکب (یا سود در سود) ہے وگرنہ عام سود میں کوئی تباہت نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے: ”اپنے مال کو کئی گنا کرنے کی خاطر سود نہ کھاؤ“۔ (سورۃ آل عمران آیت ۱۳۰) اس بنا پر سود حرام نہیں ہے۔

اسلام کے دین اور عوام کے درمیان دوستی اور احترام کی فضا کو آلودہ کرنا اہم فریضہ ہے۔ پاکستان کی حکومت کے ہر ملازم کو یاد رکھنا چاہیے۔ اس کام کے لیے دو

(۱) علماء و مراجع یا الزمام تراشی کرنا۔

(ب) نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت سے منسلک بعض افراد کو علمائے دین کی صورت

دینا اور انہیں لازہر یونیورسٹی، نجف، کربلا اور استنبول کے علمی اور دینی مراکز میں

اتارنا، علمائے دین سے لوگوں کا رشتہ توڑنے کے لیے ایک راستہ یہ بھی ہے کہ

بچوں کو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے پروگراموں کے مطابق تربیت دی

جائے۔ اس کام کے لیے ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو ہمارے تنخواہ دار ہوں

تاکہ وہ جدید علوم کی تدریس کے ضمن میں نوجوانوں کو علمائے دین اور عثمانی خلیفہ

سے متنفر کریں اور ان کی اخلاقی برائیوں اور ظلم و زیادتیوں کو بڑی آب و تاب

کے ساتھ بیان کریں اور یہ بتائیں کہ وہ کس طرح قومی سرمایہ کو اپنی عیاشیوں کو

نذر کرتے ہیں اور ان میں کسی پہلو سے اسلامی جھلک نہیں پائی جاتی۔

(۵) وجوب جہاد کے عقیدے میں تزلزل پیدا کرنا اور یہ ثابت کرنا کہ جہاد صرف

صدر الاسلام کے لیے تھا تاکہ مخالفوں کی سرکوبی کی جائے مگر آج اس کی قطعاً

ضرورت نہیں ہے۔

(۶) کافروں کی پلیدی اور نجاست سے متعلق موضوع جو خاص طور پر شیعہ حضرات کا

عقیدہ ہے، ان مسائل میں سے ہے جسے مسلمانوں کے ذہن سے خارج ہو

جانا چاہیے اور اس کے لیے قرآن اور حدیث سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر یہ آیت جس میں کہا گیا ہے کہ "اہل کتاب جو کھانا کھاتے

ہیں وہ تم پر حلال ہے اور جو تم کھاتے ہو وہ ان پر حلال ہے اور پاک دامن

عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) عورتیں تم پر حلال ہیں"۔ کیا

رسول اللہ ﷺ نے صفیہ اور ماریہ نامی یہودی اور مسیحی عورتوں سے شادی نہیں کی

تھی؟ اور کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کی یہ بیان نجس تھیں؟

(۷) مسلمانوں کو یہ بات سمجھانی چاہیے کہ دین سے حضرت ختمی مرتبت ﷺ کی مراد صرف اسلام نہیں بلکہ جیسا کہ قرآن حکیم سے بھی ثابت ہے دین میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی شامل ہیں اور تمام ادیان کے پیروکاروں کو مسلمان کہا جائے گا۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اس دنیا سے مسلمان جائیں۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی بھی یہی تمنا ہے کہ ”پروردگار ہم دونوں کو مسلمانوں کے زمرہ میں اور ہمارے خاندان کو امت مسلمہ قرار دے“ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے فرزندوں سے کہتے ہیں: ”نہ مرنا مگر حالت اسلام میں“۔

(۸) دوسرا اہم موضوع کلیساؤں اور کنیساؤں کے اسباب سے متعلق ہے۔ قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کی روشنی میں لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ اہل کتاب کی عبادت گاہیں محترم ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے: ”اگر خداوند عالم لوگوں کو منع نہ فرماتا تو لوگ نصاریٰ کے کلیساؤں، یہودیوں کے کنیساؤں اور زرتشتیوں کے آتشکدوں کو تباہ و برباد کر دیتے“ (سورۃ حج آیت ۴۰) اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام میں عبادت گاہیں محترم ہیں اور انہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔

(۹) دین یہود سے انکار پر مبنی چند حدیثیں جناب رسالت مآب ﷺ سے نقل کی گئی ہیں مثلاً یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو یا جزیرۃ العرب میں دو متفاوت ادیان کی گنجائش نہیں۔ ہمیں ہر حال میں ان احادیث کی تردید کرنی چاہیے اور یہ بتانا چاہیے کہ اگر یہ احادیث صحیح ہوتیں تو حضرت ختمی مرتبت ﷺ کبھی یہودی عورت سے شادی نہ کرتے۔

لازم ہے کہ مسلمانوں کو عبادت سے روکا جائے اور اس کے وجوب کے بارے میں ان کے دلوں میں شکوک پیدا کیے جائیں۔ خاص طور سے اس نکتہ پر زور دیا جائے کہ اگرچہ دنیا میں عبادت سے بے نیاز ہے۔ حج ایک یہودہ عمل



قرار دیا جائے اور مسلمانوں کو شدت کے ساتھ مکہ جانے سے روکا جائے۔ اس طرح مجالس اور اس سلسلہ کے تمام اجتماعات پر پابندی لگائی جائے۔ یہ اجتماعات ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہیں اور انہیں شدت کے ساتھ روکنا ضروری ہے۔ مساجد، ائمہ دین کے مزارات، امام بارگاہوں اور مدرسوں کی تعمیرات پر بھی بندش عائد کی جائے۔

(۱۱) خمس اور غنائم جنگی کی تقسیم بھی اسلام کی تقویت کا ایک سبب ہے۔ خمس کا تعلق لین دین، تجارتی اور کاروباری منافع سے نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس رقم کی ادائیگی پیغمبر اکرم ﷺ اور اماموں کے زمانے میں واجب تھی لیکن اب علمائے دین کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے اس رقم کو حاصل کریں۔ خاص طور پر جبکہ یہ لوگ اس رقم سے ذاتی فائدے حاصل کرتے ہیں اور اپنی لیے بھیڑ بکریاں، گائے، گھوڑے، باغات اور محلات خریدتے ہیں۔ اس اعتبار سے شرعاً خمس کی رقم ان کے لیے جائز نہیں ہے۔

(۱۲) لوگوں کو بروگشتہ کرنے کے لیے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام فتنہ و فساد اور ابتری اور اختلافات کا دین ہے اور اس کے ثبوت میں اسلامی ممالک میں رونما ہونے والے واقعات کو پیش کرنا چاہیے۔

(۱۳) اپنے آپ کو تمام گھرانوں میں پہنچا کر باپ بیٹوں کے تعلقات کو اس حد تک بگاڑا جائے کہ بزرگوں کی نصیحت بے اثر ہو جائے اور لوگ آمریت کی تہذیب و تمدن کا شکار ہو جائیں۔ اس صورت میں ہم نوجوانوں کو ان کے دینی عقائد سے منحرف کر کے انہیں علماء سے دور رکھ سکتے ہیں۔

(۱۴) عورتوں کی بے پردگی کے بارے میں ہمیں سعی بلیغ کی ضرورت ہے تاکہ مسلمان عورتیں خود پردہ چھوڑنے کی آرزو کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں ہمیں تاریخی دلائل و شواہد کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ پردہ کا رواج نبی عباس کے دور سے ہوا

اور یہ ہرگز اسلام کی سنت نہیں ہے۔ لوگ رسول اکرم ﷺ کی بیویوں کو بغیر پردہ دیکھتے رہے ہیں۔ صدر الاسلام کی عورتیں زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے شانہ بشانہ رہی ہیں۔ ان کوششوں کے بار آور ہونے کے بعد ہمارے ساتھیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ نوجوانوں کو نامشروع جنسی روابط اور عیاشیوں کی ترغیب دیں اور اس طرح برائیوں کو اسلامی معاشرے میں رواج دیں۔ ضروری ہے کہ غیر مسلم عورتیں پوری بے پردگی کے ساتھ اپنے آپ کو مسلم معاشرے میں پیش کریں تاکہ مسلمان عورتیں انہیں دیکھ کر ان کی تقلید کریں۔

(۱۵) جماعت کی نماز سے لوگوں کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ ائمہ و جماعت پر الزام تراشیاں کی جائیں اور ان کے فسق و فجور پر مبنی دلائل پیش کیے جائیں تاکہ لوگ ان سے متنفر ہو کر ان سے اپنا رابطہ توڑ لیں۔

(۱۶) ہماری دشواریوں میں سے ایک بڑی دشواری بزرگان دین کے مزاروں پر مسلمانوں کی حاضری ہے۔ ضروری ہے کہ مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا جائے کہ قبروں کو اہمیت دینا اور ان کی آرائشات پر توجہ دینا بدعت اور خلاف شرع ہے اور ختمی مرتبت ﷺ کے زمانہ میں مردہ پجرتی اور اس قسم کی باتیں رائج نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ ان قبروں کو مسما کر کے ان کی زیارت سے لوگوں کو مشتتہ کیا جائے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ حضرت ختمی مرتبت ﷺ مسجد النبی میں مدفون نہیں ہیں بلکہ اپنی والدہ گرامی کی قبر میں سو رہے ہیں اور اسی طرح تمام بزرگان دین کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ان مقامات پر نہیں جن مقامات کو ان سے منسوب کیا گیا ہے۔ حضرت ابو بکر و عمر دونوں جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ حضرت عثمان کی قبر کا پتہ نہیں ہے۔ حضرت علی کی آرامگاہ بصرہ میں اور وہ قبر جو نجف اشرف میں مسلمانوں کی زیارت گاہ ہے دراصل اس میں مغیرہ بن شعبہ دفن ہیں۔ امام

حسین (رضی اللہ عنہ) کا سر اقدس مسجد ”حنانہ“ میں دفن ہے اور آپ کے جسد اقدس کی تدفین کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں ہے۔ کاظمین کی مشہور زیارت گاہ میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور امام تقی علیہ السلام کی بجائے دو عباسی خلیفہ دفن ہیں۔ مشہد میں امام رضا علیہ السلام نہیں بلکہ ہارون الرشید دفن ہے۔ سامرہ میں بھی امام تقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کی بجائے عباسی خلفاء دفن ہیں۔ ہمیں بقیع کے قبرستان کے سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ خاک کے یکساں ہو جائے اور تمام اسلامی ممالک کی زیارت گاہیں ویرانوں میں بدل دی جائیں۔

(۱۷) خاندان رسالت سے اہل تشیع کی عقیدت و احترام ختم کرنے کے لیے جھوٹے اور

بناوٹی سادات پیدا کیے جائیں اور اس کام کے لیے ہمیں چند تنخواہ دار افراد کی ضرورت ہے جو عماموں کے ساتھ لوگوں میں ظاہر ہوں اور اپنے آپ کو اولاد رسول سے نسبت دیں۔ اس طرح وہ لوگ جو ان کی حقیقت سے واقف ہیں آہستہ آہستہ حقیقی سادات سے برگشتہ ہو جائیں گے اور اولاد رسول پر شک کرنے لگیں گے۔ دوسرا کام ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ہم حقیقی سادات اور علمائے دین کے سروں سے ان کے عمائے اتروائیں تاکہ پیغمبر خدا ﷺ سے وابستگی کا سلسلہ ختم ہو اور لوگ علماء کا احترام چھوڑ دیں۔

(۱۸) امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کے مراکز کو ختم کر کے ان کو ویران کر دیا

جائے اور یہ کام مسلمانوں کی گمراہی کی راہ سے روکنے اور دین کو بدبختی اور نابودی سے بچانے کے عنوان سے ہونا چاہیے۔ اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لا کر لوگوں کو مجالس عزاء میں جانے سے روکنے کی کوشش کی جائے اور عزاداری کو بدرجہ ختم کیا جائے۔ اس کام کے لیے امام بارگاہوں کی تعمیر اور علماء و ذاکرین کے اشکاب کی شرائط کو سخت بنایا جائے۔

(۱۹) آزاد خیالی اور چون و چراں والی کیفیت کو مسلمانوں کے اذہان میں راسخ کرنا

چاہیے تاکہ ہر آدمی آزادانہ طور پر سوچنے کے قابل ہو اور ہر کام اپنی مرضی سے انجام دے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں۔ احکام شریعت کی ترویج کا عمل متروک ہونا چاہیے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب سمجھا جائے تو بھی یہ کام بادشاہوں کا ہے۔ عوام الناس کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

(۲۰) نسل کو کنٹرول کیا جائے اور مرد کو ایک سے زیادہ بیوی اختیار کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ نئے قوانین وضع کر کے شادی کے مسئلہ کو دشوار بنایا جائے مثلاً عرب مرد ایرانی عورت سے اور ایرانی مرد کو عرب عورت سے شادی کی اجازت نہ دی جائے۔ اس طرح ترک، ایرانیوں سے شادی نہیں کر سکیں گے۔

(۲۱) اسلامی تعلیم کی آفاقیت کے مسئلہ کو محکم دلائل سے رد کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسلام اصولاً دین ہدایت نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف ایک قبیلہ اور ایک قوم سے ہے جیسا کہ قرآن نے اقرار کیا ہے:

”یٰٰدین تمہارے اور تمہارے قبیلہ کی ہدایت کے لیے ہے“ (سورۃ زخرف آیت ۲۳)

(۲۲) مساجد، مدارس، تربیتی مراکز اور اچھی بنیادوں پر قائم ہونے والی تعمیرات سے متعلق اسلام کی تمام سنتوں کو کالعدم یا کم از کم محدود کر دیا جائے۔ اس قسم کے امور کا تعلق علماء سے نہیں بلکہ سربراہان مملکت سے ہے اور جب حکومتیں اس قسم کا کام انجام دین گی تو از خود ان کی دینی قدر و قیمت جاتی رہے گی۔

(۲۳) ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں جو قرآن میں کی پیشی کر کے لوگوں کو

تھک میں مبتلا کیا جائے۔ خاص طور پر کفار اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں تو ہیں

میں جو ان کے ہاتھوں سے متعلق آجوں کو قرآن سے حذف کیا

جائے۔ ان کے ہاتھوں سے متعلق آجوں کو قرآن سے حذف کیا

جائے۔ ان کے ہاتھوں سے متعلق آجوں کو قرآن سے حذف کیا

غیر عرب، مسلم حکومتوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں قرآن، اذان اور نماز کو عربی زبان میں پڑھنے سے پرہیز کریں۔ دوسرا مسئلہ احادیث و روایات میں تشکیک پیدا کرنا ہے اور قرآن کی طرح اس میں بھی تحریف و ترجمہ سے کام لینا ہے۔

مختصر یہ کہ اس دوسری کتاب میں بھی مجھے بڑی کارآمد چیزیں دکھائی دیں۔ اس کتاب کا نام ”اسلام کو کیونکر صفحہ ہستی سے مٹایا جائے گا“ رکھا گیا تھا۔ اس میں وہ بہترین عملی پروگرام تھے جن پر مجھے اور میرے دیگر ساتھیوں کا کام کرنا تھا۔ اس کتاب نے مجھ پر بڑا اثر قائم کیا تھا۔ کتاب کے مطالعے کے بعد میں اسے واپس کرنے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت پہنچا جہاں دوسری مرتبہ سیکرٹری سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے مخاطب ہو کر کہا:

”جن امور کو تمہیں انجام دینا ہے اس میں تم اکیلی نہیں ہو بلکہ تقریباً پانچ ہزار سچے اور کھرے افراد مختلف گروہوں کی صورت میں تمام اسلام ممالک میں تمہاری مدد کے لیے آمادہ ہیں۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا خیال ہے کہ وہ کام کی پیشرفت کے ساتھ ساتھ ان افراد کی تعداد میں اضافہ کر کے انہیں ایک لاکھ تک پہنچا دے۔ جب بھی ہمیں اس عظیم گروہ کی تشکیل میں کامیابی ہوئی یقیناً ہم تمام عالم اسلام پر چھا جائیں گے اور اسلامی آثار کو مکمل طور پر مٹا دیں گے۔“

سیکرٹری نے کہا:

”میں تمہیں یہ خوشخبری دیتا ہوں کہ ہم آئندہ ایک صدی میں اپنی مراد کو پہنچ جائیں گے اور اگر آج ہماری نسل اس کامیابی کو نہ دیکھ سکے گی تو ہماری اولادیں ضرور یہ اچھے دن دیکھیں گی اور ایرانی ضرب المثل کتنی معنی خیز ہے جس میں کہا گیا ہے: ”کل دوسروں نے بویا ہم نے کھایا۔ آج ہم بورے ہیں کل دوسرے کھائیں گے۔“ جس وقت بھی عظیم برطانیہ یا (سندروں کی ملکہ) کو اسلامی ممالک پر فتح مندی نصیب ہوئی دنیا بھر میں مسیحیت ان تمام نکالیف سے نجات پائے گی جسے وہ بارہ (۱۲) صدیوں سے برداشت کر رہی ہے۔“



مسلمانوں نے اس عرصہ میں ہم پر بڑی جنگیں مسلط کیں جن میں صیبی جنگیں بطور مثال ہیں۔ یہ جنگیں بالکل مغلوں کی یلغار کی طرح بے مقصد تھیں کہ جہاں سوائے قتل و غارت گری، ویرانی و تباہی اور لوٹ مار کے، کوئی مقصد نہیں تھا لیکن اسلام کے خلاف ہماری جنگ مغلوں کی طرح محض فوجی کارروائیوں اور قتل و غارت گری پر منحصر نہیں ہے۔ ہمیں اس کام کو جلدی بھی نہیں ہے۔ عظیم برطانیہ کی حکومت اسلام کو مٹانے کے لیے پورے مطالعے کے ساتھ آگے بڑھے گی اور بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنے عظیم کاموں کو برویکار لائے گی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی البتہ ہم ضروری مواقع پر فوجی کارروائیوں سے بھی دریغ نہیں کریں گے مگر یہ اس صورت میں ہوگا جب ہم اسلامی حکومتوں پر پوری طرح چھا جائیں گے اور کچھ عناصر ہماری مخالفت پر اتر آئیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ استنبول کے حکمران بڑے ہوشمندی اور فراست کے مالک ہیں اور اتنی جلد ہمیں اپنے پروگراموں میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے لیکن ہمیں ابھی سے متوسط طبقے کے بچوں کو ان سکولوں میں تربیت دینا ہے جو ہم نے ان کے لیے قائم کیے ہیں۔ ہمیں ان علاقوں میں متعدد چرچ بھی بنانے ہیں۔ شراب، جوا اور شہوت رانی کو اس طرح پھیلانا ہے کہ نوجوان نسل دین و مذہب کو بھول جائے۔ ہمیں اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے درمیان اختلافات کی آگ کو بھی ہوا دینا ہے ہر طرف ہرج مرج اور فتنہ کا بازار گرم کرنا ہے۔ ارکان حکومت اور صاحبان ثروت کو حسین و جمیل اور شوخ و چمکل عیسائی عورتوں کی دام میں پھنسانا ہے اور ان کی محفلوں کو ان پریشانیوں سے رونق بخشنا ہے تاکہ وہ آہستہ آہستہ اپنی دینی اور سیاسی اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ لوگ ان سے بدظن ہو جائیں اور اسلام کے بارے میں ان کا ایمان کمزور ہو جائے جس کے نتیجے میں علماء، حکومت اور عوام کا اتحاد ٹوٹ جائے اور ایسے حالات میں جنگ کی آگ بھڑکا کر ہم ان ممالک میں اسلام کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں گے۔“

نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری نے اس دوسرے راز سے بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اسے لکھا تھا اور میں شدت سے جس کے اظہار میں تھا اور یہ وہ

قرارداد تھی جو حکومت برطانیہ کے اعلیٰ عہدیداروں نے منظور کی تھی۔ پچاس صفحات پر مشتمل یہ قرارداد نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت کی اس سیاست کی آئینہ دار تھی جس کے ذریعے اسلام اور اہل اسلام کو ایک صدی کے اندر اندر نابود کرنا تھا۔ اس رسالہ کی پشین گوئی کی مطابق اس عرصے کے بعد اسلام ساری دنیا سے رخصت ہو جائے گا اور تاریخ میں اس کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔ اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ ۱۴ نکاتی قرارداد کے مضمون کو صیغہ راز میں رکھا جائے گا اور یہ کسی عنوان سے ظاہر نہ ہونے پائے کیونکہ اس بات کا خطرہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کی خبر ہو جائے اور وہ اس کی چارہ جوئی میں اٹھ کھڑے ہوں تاہم مختصر طور پر اس کا مواد کچھ یوں تھا:

(۱) تاجکستان، بخارا، ارمنستان، شمالی خراسان اور ماوراء النہر اور روس کے جنوب میں واقع مسلم آبادیوں پر اختیار حاصل کرنے کے لیے سلطنت روس سے وسیع پیمانے پر اشتراک عمل، اس کے علاوہ ایران کے سرحدی شہروں ترکستان اور آذربائیجان پر تسلط حاصل کرنے کے لیے روس کے ساتھ اشتراک عمل۔

(۲) اسلامی حکومتوں کو اندرونی اور بیرونی اعتبار سے پوری طرح تباہ کرنے کے لیے ایک منظم پروگرام کی تشکیل میں روس اور فرانس کے سلاطین کے ساتھ اشتراک عمل۔

(۳) عثمانی اور ایرانی حکومتوں کے درمیان تنازعات کو ہوا دینا اور ان کے درمیان قومی اور نسلی اختلافات کی آگ بھڑکانا۔ عراق اور ایران کے اطراف میں آباد قبیلوں میں قبائلی جنگیں اور شورشیں پیدا کرنا۔ ما قبل اسلام مذاہب کی تبلیغ حتیٰ کہ ایران، مصر اور بین النہرین کے متروک اور مردہ ادیان کا احیاء اور ان کے پیروکاروں کو اسلام سے پھیر دینا۔

(۴) اسلامی ممالک کے شہروں اور دیہاتوں کے بعض حصوں کو غیر مسلم اقوام کے

حوالے کرنا مثلاً مدینہ یہودیوں کو، اسکندریہ عیسائیوں کو، یزد پارسیوں کو، عمارہ صابئیوں کو، کرمان شاہ علی الملہیوں کو، موصل یزدیوں کو اور بوشہر سمیت خلیج فارس

کے قرب و جوار کے علاقے ہندوؤں کو سونپنا۔ ان دو آخر الذکر غلاقوں میں پہلے اہل ہند کو بسانا ضروری ہے۔ اس طرح لبنان میں واقع طرابلس دروزیوں کے، قارض علویوں کے اور مسقط خوارج کے حوالے کرنا۔ یہی نہیں بلکہ مادی امداد جنگی ساز و سامان اور فوجی اور سیاسی ماہرین کے ذریعے انہیں مضبوط بنانا بھی ضروری ہے تاکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ اقلیتیں اہل اسلام کی آنکھوں میں کھٹکنے لگیں اور اسلام کا پیکر آزرده ہو جائے اور علاقے میں بترتج ان کا اثر نفوذ مسلم حکومتوں کی تباہی کا سبب بن جائے اور اسلام کی ترقی پذیری میں رخنہ پڑ جائے۔

(۵)

ہندوستان کی ایرانی اور عثمانی حکومتوں میں بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قیام عمل میں آئے اور پھر پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو یا بہتر الفاظ: ”پھوٹ ڈالو اور مٹا دو“ کے قانون پر عمل کرتے ہوئے انہیں ایک دوسرے سے بھڑا دیا جائے۔ اس صورت میں ایک طرف وہ آپس میں دست و گریباں ہوں گی اور دوسری طرف مرکزی حکومت سے بھی ان کے تنازعہ کا سامان فراہم رہے گا۔

(۶)

ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلام دنیا میں لوگوں کے افکار سے ہم آہنگی رکھنے والے من گھڑت عقائد و مذاہب کی تبلیغ مثلاً اہلبیت (علیہم السلام) سے بے انتہا عقیدت و احترام رکھنے والے شیعوں کے حسین المہدی مذہب، امام جعفر صادق علیہ السلام کی ذات سے متعلق شخصیت پرستی، امام علی رضا علیہ السلام اور امام غائب (حضرت مہدی موعود) کے بارے میں مبالغہ آرائی اور ہشت امامی فرقہ کی ترویج۔ ہر مذہب کے لیے اس کے مناسب ترین مقام کی یہ صورت ہو گی: حسین اللہ فرقہ (کہ بلا) امام جعفر صادق کی پرستش (اصنہان) امام مہدی علیہ السلام کی پرستش (سامرو) اور ہشت امامی مذہب (مشہد)۔ ان جعلی مذاہب کی ترویج کا دائرہ صرف شیعہ مذہب تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے

بلکہ اہل تسنن کے تمام فرقوں میں بھی اس قسم کے مذاہب کو ترویج دیا جانا چاہیے اور پھر ان میں اختلافات کو ہوادے کرنفرت کا وہ بیج بونا چاہیے کہ ان کا ہر فرقہ اپنے آپ کو سچا مسلمان اور دوسرے کو کافر، مرتد اور واجب القتل سمجھے۔

(۷) زنا، لواطت، شراب نوشی اور جواوہ اہم امور ہیں جنہیں مسلمانوں کے درمیان راج کرنے کی ضرورت ہے۔ ان بری عادتوں کو مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے علاقے کے ان لوگوں سے زیادہ مدد لینی چاہیے جو ما قبل اسلام دیگر مذاہب سے وابستہ تھے اور خوش قسمتی سے ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

(۸) اہم اور حساس عہدوں پر غلط کار اور ناپاک افراد کا تقرر اور اس بات پر توجہ کہ ریاستوں کی سربراہی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت سے وابستہ رہنی چاہیے تاکہ وہ انگلستان کی حکومت کے لیے کام کریں اور ان سے احکامات وصول کریں۔ پھر ان بااثر افراد کے ذریعے ہمارے مقاصد پوشیدہ طور پر قوت کے سہارے رو بہ عمل آئیں البتہ ان کے چناؤ میں مسلم بادشاہوں کا ہاتھ ہوگا۔

(۹) غیر عرب مسلم ممالک میں عربی ثقافت اور زبان کے پھیلاؤ روکنا اور اس کی بجائے سنسکرت، فارسی گروی، پشتو، اردو اور قومی زبانوں کو ان سرزمینوں پر راج کرنا تاکہ علاقائی زبانیں رواج پا کر عربی زبان بولنے والے قبائل میں اثر آئیں اور فصیح عربی زبان کی جگہ اختیار کریں۔ اس طرح اہل عرب کا قرآن اور سنت سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

(۱۰) حکومتی دفاتر میں مشیروں اور ماہروں کی حیثیت سے برطانوی عمال اور جاسوسوں کی تعیناتی میں اضافہ، اس طرح اسلامی ممالک کے وزراء اور امراء کے فیصلوں میں ہمارا رنگ شامل رہے گا۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے سب سے بہتر راستہ یہ ہوگا کہ ہم پہلے ذہین اور معتد غلاموں اور کینیروں کو تعلیم و تربیت دیں اور پھر انہیں

حکمرانوں، شاہزادوں، وزیروں، امیروں اور اہم درباری عہدوں پر فائز بااثر افراد کے ہاتھوں بچ دیں۔ یہ غلام اپنی صلاحیتوں اور فہم و فراست کی بنیاد پر ان کے نزدیک اپنا مقام پیدا کریں گے اور آہستہ آہستہ انہیں مشاورت کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح مسلم رجال میں ان کا ایک نمٹ نقش قائم ہو جائے گا۔

(11)

مسلمانوں کے مختلف طبقوں خاص طور پر ڈاکٹروں، انجینئروں، حکومت کے مالی امور سے وابستہ عہدہ داروں اور ان جیسے دیگر روشن فکر افراد میں مسیحیت کی تبلیغ و ترویج، کلیساؤں، خصوصی اسکولوں اور کلیسا سے وابستہ شفا خانوں کی تعداد میں اضافہ، تبلیغی کتب و رسائل کی نشر و اشاعت اور متوسط طبقہ کے لوگوں میں ان کی مفت تقسیم تاریخ اسلام کے مقابلہ پر تاریخ مسیحیت کی نگارش کا اہتمام، مسلمانوں کے حالات و کیفیات اور ان میں حکومت برطانیہ کے عمال اور جاسوسوں کا تقرر البتہ ان کا دائرہ عمل اسلامی ممالک میں ذریعہ کلیسا ہی ہوں گی۔ ان عالم نما عیسائیوں میں بعض کا کام یہ ہو گا کہ وہ مستشرق اور اسلام شناس بن کر تاریخی حقائق میں تحریف کریں اور انہیں برعکس دکھانے کی کوشش کریں اور پھر دلائل کی فراہمی اور اسلامی ممالک سے ضروری اطلاعات حاصل کرنے کے بعد ایسے مقالے تیار کریں جو اسلام کے نقصان اور عیسائیت کے فائدے میں ہوں۔

(12)

مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں خود سری اور مذہب سے بیزاری کی ترویج اور انہیں اسلام کے اصول و مہمانی کی سچائی کے بارے میں بدظن کرنا اور یہ کام مشرقی اسکولوں، اخلاق باختہ اور اسلام دشمنی پر مبنی کتابوں، عیش و نوش اور خوش حالی کا سامان فراہم کرنے والے کلبوں اور غلط بنیادوں پر استوار مسلم اور غیر مسلم جوانوں کو بچانے کے لیے یہودی اور مسیحی نوجوانوں کی شراکت سے

کریں گے۔



(۱۳) اسلام کو کمزور کرنے، مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے اور انہیں زندگی کے مسائل

کے بارے میں سوچنے اور ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے اسلامی ممالک میں اندرونی اور بیرونی طور پر شورشیں پیدا کرنا اور مسلمانوں کو ایک دوسرے یا پھر دیگر ادیان کے پیروکاروں سے بھڑائے رکھنا۔ قومی دولت، مالی ذخائر اور فکر و فہم کی قوتوں کو تباہی سے دوچار کرنا، مسلمانوں میں روح عمل اور ولولہ انگیزی کو ختم کرنا اور ان میں انتشار پیدا کرنا۔

(۱۴) اسلامی ممالک کے اقتصادی نظام کو درہم برہم کرنا جس میں زراعت اور آمدنی

کے تمام ذرائع شامل ہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے بندوں میں شکاف پیدا کرنا، دریاؤں میں ریت کی سطح اونچی کرنا، لوگوں میں سستی، سہل انگاری اور تن آسانی کو فروغ دینا، پیداوار اور تولیدی امور کی طرف سے لوگوں کی بے توجہی کو تقویت دینا اور عوام کو منشیات کا عادی بنانا ضروری ہے۔ (۱)

اس بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ چودہ نکات انتہائی شرح وسط کے ساتھ ضبط تحریر میں لائے گئے تھے اور ان کے ساتھ نقشے، علامتیں اور تصویریں بھی تھیں۔ میں نے یہاں اشارتاً ان کی نشاندہی کی ہے۔ مختصر یہ کہ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری سے اس بھروسے کی بنیاد پر جو اس نے میرے ذات سے وابستہ کر رکھی تھی اور جس کے زیر اثر اس نے مجھے اتنی اہم اور خفیہ کتاب پڑھنے کو دی تھی میں دوسری بار بصد احترام اظہار تشکر کیا اور مزید ایک مہینے لندن میں رہا۔ اس کے بعد وزیر کی طرف سے مجھے عراق جانے کا حکم ملا۔ میرا یہ سفر صرف اس مقصد کے لیے تھا کہ میں محمد بن عبدالوہاب کو نئے دین کے اظہار کی دعوت پر آمادہ کروں۔ سیکرٹری نے بار بار مجھے تاکید کی کہ میں اس کے ساتھ

(۱) اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو آج مسلمان زیادہ تر سازشوں کا شکار ہو چکے ہیں اور یہی چیز تیزی

کا باعث بن رہی ہے۔

بڑی رعایت اور ہوشیاری کے ساتھ پیش آؤں اور مقدمات امور کی آمادگی میں ہرگز حد اعتدال سے آگے نہ بڑھوں کیونکہ عراق و ایران سے موصول ہونے والی رپورٹوں کی بنیاد پر سیکرٹری کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ محمد بن عبدالوہاب قابل بھروسہ اور نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے پراگراموں کو روک دینا کے لیے مناسب ترین آدمی ہے۔

اس کے بعد سیکرٹری نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

”تمہیں محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ بالکل واضح اور دو ٹوک الفاظ میں گفتگو کرنی

ہے کیونکہ ہمارے عمال اصفہان میں اس سے بڑی صراحت کے ساتھ پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں اور وہ ان باتوں کو مان چکا ہے مگر اس شرط کی ساتھ کہ اسے عثمانی حکومت کے مقامی عمال، علماء اور متعصب لوگوں کے ہاتھوں آنے والے خطرات سے بچالیا جائے اور اس کی حمایت اور تحفظ کا بھرپور انتظام کیا جائے کیونکہ اس کی دعوت کے ظاہر ہوتے ہی ہر طرف سے اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی اور خطرناک صورتوں میں اس پر حملے کیے جائیں گے۔“

حکومت برطانیہ نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو اسلحے سے اچھی طرح لیس کرنے کے بعد ضرورت کے موقع پر اس کی مدد کی تائید بھی کی تھی اور شیخ کی مرضی کے مطابق جزیرہ العرب میں واقع نجد کے قریب علاقے کو اس کی حاکمیت کا پہلا مقام قرار دیا تھا۔

شیخ کی موافقت کی خبر سن کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں نے سیکرٹری

سے صرف یہ سوال کیا کہ میری آئندہ کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟ مجھے اس کے بعد کیا کرنا چاہیے؟ اور شیخ سے کس قسم کا کام لینا ہوگا۔ نیز یہ کہ میں اپنے فرائض کا کہاں سے آغاز کروں؟

سیکرٹری نے جواب دیا: نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے تمہارے فرائض کو بڑی

توجہ سے متعین کیا ہے اور وہ ان امور کی نگرانی ہے جسے شیخ کو تدبیر نجا انجام دینا ہے، وہ یہ ہیں:

1۔ ان کے مذہب میں شمولیت اختیار نہ کرنے والے مسلمانوں کی تکفیر اور ان کے

2۔ عزت اور آبرو کی بربادی کو روکنا، اس ضمن میں گرفتار کیے جانے والے

3۔ ان کو برص فریڈی کی مارکیٹ میں غلام و کنیر کی حیثیت میں بیچنا۔

(۲) بت پرستی کے بہانے بصورت امکان خانہ کعبہ کا انہدام اور مسلمانوں کو فریضہ حج سے روکنا اور حاجیوں کے جان و مال کی غارت گری پر قبائل عرب کو اکسانا۔

(۳) عرب قبائل کو عثمانی خلیفہ کے احکامات سے سرتابی کی ترغیب دینا اور ناخوش لوگوں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنا۔ اس کام کے لیے ایک ہتھیار بند فوج کی تشکیل۔ اشراف حجاز کے احترام اور اثر و نفوذ کو توڑنے کے لیے انہیں ہر ممکن طریقے سے پریشانیوں میں مبتلا کرنا۔

(۴) پیغمبر اسلام ﷺ، ان کے جانشینوں اور کلی طور پر اسلام کی برگزیدہ شخصیتوں کی اہانت کا سہارا لے کر اور اسی طرح شرک و بت پرستی کے آداب و رسوم کو مٹانے کے بہانے مکہ، مدینہ اور دیگر شہروں میں جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی زیارت گاہوں اور مقبروں کی تاراجی۔

(۵) جہاں تک ممکن ہو سکے اسلامی ممالک میں فتنہ و فساد، شورش اور بد امنی کا پھیلاؤ۔

(۶) قرآن میں کی بیشی پر شاہد آ حدیث و روایات کی رو سے ایک جدید قرآن کی نشر و اشاعت۔

سیکرٹری نے اپنے اس چھ نکاتی پروگرام کی تشریح کے بعد سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو انجام دینا تھا اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

”کہیں اس پروگرام کی دشواریاں تمہیں گھبراہٹ میں مبتلا نہ کر دیں۔ ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اسلام کی تباہی کا بیج اس سرزمین پر بکھیر دیں تاکہ ہماری آئندہ نسلیں اس راہ پر آگے بڑھیں اور کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ سکیں۔ برطانیہ کی حکومت ہماری اس صبر آزما دلازدت کوششوں سے واقف ہے۔ کیا محمد ﷺ نے یکہ و تہما اپنی اس تباہ کن انقلاب کو برپا نہیں کیا۔ محمد بن عبدالوہاب بھی (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کی طرح ہمارے پیش نظر انقلاب کو شہدہ ور کر سکے گا۔“

اس ملاقات کے کچھ دن بعد میں نے وزیر اور سیکرٹری سے سفر کی اجازت چاہی اور پھر گھر والوں اور دوستوں کو الوداع کیا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے میرے چھوٹے لڑکے نے ملتانہ لہجے میں کہا ”بابا جلدی گھر آئیے گا“ اس کے اس جملے نے میری آنکھیں نم آنسو کر دیں اور میں ان اشکوں کو اپنی بیوی سے نہ چھپا سکا۔

ہمارا جہاز بصرہ کی سمت روانہ ہوا۔ بڑے دشوار اور سخت سفر کے بعد رات کے وقت بصرہ پہنچا اور سیدھا عبدالرضا ترکان کے گھر پہنچا۔ وہ بیچارہ سو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بہت خوش ہوا اور بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے رات وہاں کائی۔ دوسری صبح مجھے عبدالرضا سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کچھ عرصہ پہلے ایران سے بصرہ پہنچا اور ابھی چند دن پہلے کسی نامعلوم مقام کی طرف خدا حافظ کہہ کر گیا ہے۔ عبدالرضانے یہ بھی بتایا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب میرے نام ایک خط بھی دی گیا ہے۔ اس خط میں اس نے اپنا پتہ نجد کا لکھا تھا۔

دوسرے دن میں اکیلا عازم نجد ہوا اور بڑے زحمتوں کے بعد منزل مقصود پر پہنچا اور شیخ سے اس کے گھر پر ملا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے اس موضوع پر اس سے گفتگو مناسب نہیں سمجھی لیکن جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ اس نے دوسری شادی رچالی ہے اور جنسی روابط میں افراط سے کام لے گا اپنی طاقت کھو بیٹھا ہے۔ میں نے اس بارے میں اسے نصیحتیں کیں اور بتایا کہ ابھی ہم دونوں نے مل کر بہت سے امور انجام دینے ہیں۔ اس منزل پر ہم نے یہ طے کیا کہ میں اپنے آپ کو ”عبداللہ“ کے فرضی نام سے بطور غلام پیش کر دوں گا اور بتاؤں کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے مجھے بردہ فروشوں کے روئے فریاد ہے چنانچہ شیخ نے لوگوں سے میرا اسی عنوان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ بصرہ میں اس کے کام سے ٹھہرا ہوا تھا اب یہاں نجد پہنچا ہوں۔

نجد میں رہنے والے شیخ محمد بن عبدالوہاب کا غلام سمجھتے تھے۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہوگا کہ اس مقام پر شیخ کی دعوت کا سامان فراہم کرنے میں ہمیں دو سال کا عرصہ لگانا پڑا۔ شیخ نے اپنے نئے دین کے

اعلان کا حتمی ارادہ کیا اور اپنے دوستوں کو اکٹھا کیا جو اس کے ہم خیال تھے اور اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔ ابتداء میں صرف اپنی خاص اصحاب اور مریدوں کے دائرہ میں چند مبہم اور غیر واضح الفاظ میں بڑے اختصار کی ساتھ اس دعوت کا آغاز ہوا لیکن کچھ عرصہ کے بعد نجد کے ہر طبقہ کے افراد کو بڑے پیمانے پر دعوت نامے بھیجے گئے۔ آہستہ آہستہ ہم نے پیسہ کے زور پر شیخ کے افکار کی حمایت میں ایک بڑا مجمع اکٹھا کیا اور انہیں دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کی تلقین کی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جزیرۃ العرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ اس کے مخالفوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔

جلد ہی رکاوٹوں اور دشمنیوں کا سلسلہ اس منزل تک پہنچا کہ شیخ کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ خاص طور پر نجد میں اس کے خلاف بڑی خطرناک باتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی قاطعیت کے ساتھ اسے جسے رہنے کی ترغیب دی اور اس کے ارادے کو مست نہیں ہونے دیا۔ میں ہمیشہ محمد بن عبدالوہاب سے کہتا تھا: ”بعثت کے ابتدائی دنوں میں اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی دشمن تمہارے دشمنوں سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے مگر آپ ﷺ ان کی پیدا کردہ دشواریوں اور مصیبتوں کو بڑی تحمل کے ساتھ جھیلتے رہے۔ ان اذیتوں، تہمتوں اور دشنام طرازیوں کے سبے بغیر کسی بڑی راہ پر گامزن ہونا اور بلند یوں کو چھوٹا کرنا ممکن ہے۔ کوئی پیشوا اور کوئی رہبر ان دشواریوں سے دامن نہیں چھڑا سکا۔

اس طرح ہم نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور خطرناک دشمنوں کے مقابل آئے۔ ہمارے کامیاب پروگراموں میں ایک پروگرام شیخ محمد بن عبدالوہاب کے دشمنوں کو پیسے کے ذریعے توڑنا تھا۔ ہمارے یہ تنخواہ دار اب مخالفین کی صف میں رہ کر ہمارے لیے جاسوسی کرتے تھے اور ان کے ارادوں سے ہمیں آگاہ رکھتے تھے۔ ہم ان بظاہر دشمن ہاتھیوں کے ذریعے مخالفین کی تمام اسکیموں کو نقش بر آب کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار میں نے سنا چند آدمیوں کے ایک گروہ نے شیخ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں نے فوری اقدامات کے ذریعے اس قتل کی سازش کو ناکام بنایا اور ان گروہ کو اتاروا کیا کہ بات شیخ محمد

بن عبدالوہاب کے حق میں تمام ہوئی اور لوگوں نے دہشت گردوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔

آخر کار شیخ محمد بن عبدالوہاب نے مجھے یہ اطمینان دلایا کہ وہ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے چھ نکاتی پروگرام کو رو بہ عمل لانے میں اپنی پوری کوشش کرے گا۔ تاہم اس نے دو نکات کے بارے میں خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ان میں سے ایک مکہ پر تصرف حاصل کرنے کے بعد خانہ کعبہ کا انہدام تھا شیخ محمد بن عبدالوہاب کے نزدیک یہ ایک بیہودہ اور خطرناک کام تھا کیونکہ اہل السلام اتنی جلدی اس کے دعوے کو تسلیم کرنے والے نہیں تھے اور یہی صورت حج کے بت پرستی قرار دینے کی تھی۔ دوسرا امر جو اس کے بس سے باہر تھا وہ ایک جدید قرآن کی نگارش تھی۔ وہ قرآن کے مقابل نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مکہ اور استنبول کے حکام سے خائف تھا اور کہتا تھا کہ میں نے کعبہ کو ڈھا دیا اور نئے قرآن کی نگارش کی تو اس بات کا خطرہ ہے کہ عثمانی حکومت ایک بڑی فوج میری سرکوبی کے لیے عربستان بھیجے اور ہم اس پر پورے نہ اتر سکیں۔ میں نے اس کے عذر کو معقول سمجھا اور اندازہ لگایا کہ اس دور کی سیاسی اور مذہبی فضا اس بات کی متقاضی نہیں ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کے برسوں کے بعد جب چھ نکاتی پروگرام کامیابی کی پوری منزلیں طے کر چکا تو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے ارادہ کیا کہ اب سیاسی اعتبار سے بھی جزیرۃ العرب میں کوئی کام ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے عمال میں سے محمد بن سعود (۱) کو محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ اشتراک عمل پر مامور کیا اور اس کام کے لیے محمد بن عبدالوہاب کے پاس خفیہ طور پر ایک نمائندہ بھیجا تا کہ اس کے سامنے حکومت برطانیہ کے مقاصد کی توضیح کرے اور ”محمد بن“ (یعنی محمد بن عبدالوہاب اور محمد بن سعود) کے اشتراک عمل کی ضرورت پر زور دے اور تاکید کرے کہ دینی امور کے فیصلے کلی طور پر محمد بن عبدالوہاب کے ہاتھ میں ہونگے اور سیاسی امور کی نگرانی محمد بن سعود کی ذمہ داری ہوگی۔

(۱) سعودی خاندان کی مورث علی جس نے ۱۱۱۴ھ میں وہابی مذہب اختیار کیا اور حکومت برطانیہ

کی طرف سے نجد کا حکمران بنا اور ۱۱۱۷ھ سے حکمران ہوا۔



نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا ہدف مسلمانوں کے جسم و جان دونوں پر اتنا اثر و نفوذ قائم کرنا تھا اور تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سیاسی حکومتوں سے دینی حکومتیں زیادہ دیر اور طاقتور رہی ہیں۔

اس طرح دینی اور سیاسی شخصیتوں کے اتحاد عمل کے نتیجے میں انگریزوں کا بھلا ہو رہا تھا اور ہر آنے والا دن اس بھلائی میں اضافہ کر رہا تھا۔ ان دونوں رہبروں نے نجد کے قریب ”درعیہ شہر“ کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت خفیہ طور پر دل حوال کر ان مالی اعانت کر رہی تھی مذکورہ کی پلاننگ کے تحت حکومت کو بظاہر کچھ غلام خریدنے تھے جو دراصل نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت ہی کے کچھ آدمی تھے جنہیں عربی زبان پر عبور حاصل تھا اور جو صحرائی جنگوں کے فنون سے بھی واقف تھے۔ ان تمام باتوں کا انتظام بھی ہماری حکومت نے کیا تھا۔ میں نے ان افراد کے اشتراک عمل سے جو تعداد میں گیارہ تھے اس اسلامی حکومت کی دینی اور سیاسی راہیں معین کیں۔ دونوں ”(یعنی محمد بن عبدالوہاب اور محمد بن سعود)“ اپنے فرائض سے بخوبی واقف تھے اور ان معین کی جانے والی راہوں پر نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھار ان دونوں کے درمیان جزوی کشمکش ہو جایا کرتی تھی اور وہیں اس کا فیصلہ بھی ہو جایا کرتا تھا اور نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو اس میں دخل اندازی کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

ہم نے نجد کے اطراف کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ مسلمان عورتوں میں محبت، خلوص اور شوہرداری کی صفت واقعی حیرت انگیز اور قابل تعریف ہے۔ ہم ان رشتوں کے ذریعے اہل نجد کے ساتھ دوستی، ہم دلی اور تعلقات کو اور زیادہ مضبوط بنا سکے۔ اس وقت ہم ان کے ساتھ وقتی کی معرانی پر ہیں۔ مرکزی حکومت جزیرۃ العرب میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اگر کوئی ناگوار حادثہ رونما نہ ہوا تو بہت جلد اسلامی سرزمینوں پر بکھیرے ہوئے بیخ تناور درختوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہمیں ان سے اپنے مطلوبہ پھل حاصل ہوں گے۔

## یہاں پر ہمفرے کے اعتراف اختتام پذیر ہوئے

برطانوی حکومت کی پرورش میں نجدی فتنہ آہستہ آہستہ بڑھتا رہا حتیٰ کہ لوگ اسلامی تعلیمات اور عقائد میں اسی طرح رخنہ اندازی کرنے لگے، جس طرح فرنگیوں نے چاہا تھا۔ بہت سے لوگ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بزرگان دین کے عقائد و نظریات کو بھلا کر بد عقیدگی اور گمراہی کی راہ چل نکلے۔ یہی وجہ ہے کہ اب انہیں حضرت شیخ مجدد الف ثانی کے مکتوبات شریف سمجھ نہیں آتے، انہیں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب ”اخبار الاخیار“ میں سچے عقائد کی جھلک نظر نہیں آتی اور حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی کتاب ”فیصلہ مفت مسئلہ سے جی چراتے ہیں۔ افسوس! قرآن کریم نے ہمیں ابلیس کی دشمنی سے آگاہ کیا لیکن ہم نے تعلیمات قرآن کو بھلا دیا۔ چنانچہ لوگ گمراہی کی دلدل میں پھنستے چلے گئے، درحقیقت اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں نے تبلیغ، اصلاح اور تربیت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے تبلیغ کرنے کے لیے گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا تو انہیں بھی اسی ”فرنگی جال“ میں پھنسا کر بے بس کر دیا گیا۔ جنہوں نے اسلام کی روشنی دنیا بھر میں پھیلانے والے بزرگوں سے رہنمائی لینا تھی، وہ ان کے خلاف ہو گئے، جنہوں نے بزرگان دین سے روحانی فوائد حاصل کرنا تھے، وہ اس فائدے ہی کو شرک و بدعت تصور کرنے لگے۔

لیکن یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے ہر زمانے میں حق کی دعوت دینے والے مقرر فرمائے ہیں، لہذا دور حاضر میں اہلسنت و جماعت کی بے حسی اور جمود کو ختم کرنے اور ”ہمفرے“ کے مشن کو نقطہء انجام تک پہنچانے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی کی تعلیمات کے زیر سایہ اور شیخ المشائخ سید میر طیب علی شاہ بخاری سجادہ نشین حضرت کرماں والے (اوکاڑہ) کی زیر سرپرستی ”نقشبندی مجددی قافلے“ ہر علاقے ہر شہر اور گلی سے نکلیں گے اور بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو ”خود کی اندھی کھائی“ میں گرنے سے بچا کر نبی اکرم ﷺ کے حضور پیش کریں گے تاکہ اللہ

(انشاء اللہ تعالیٰ عزوجل)

## نقوش۔ محبت کی تلاش

ایک ایسی تحریر جسے سر کی آنکھوں سے نہیں بلکہ  
دل کی آنکھوں سے پڑھنے کی ضرورت ہے

(صلاح الدین محمود)

ترکوں نے حجاز پر اپنی دور حکومت کے دوران رسول پاک ﷺ کی ولادت  
باسعادت سے لے کر آپ کے وصال مبارک تک کے ہر لمحے سے وابستہ ہر جسمانی،  
روحانی، تاریخی اور جمالیاتی کیفیت کو آئندہ نسلوں کے واسطے محفوظ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ  
کام غیر شعوری سطح پر تو عہد نبوی ﷺ ہی سے جاری تھا، مگر اب کوئی ایک ہزار برس گزر چکے  
تھے اور اب یہ ضروری تھا کہ ایک شعوری اور حتمی سطح پر یہ عمل ہو۔ اس کام کے واسطے جنون کی  
حد تک رسول پاک ﷺ سے محبت اور انسانی حواس کی حدود تک نفاست اور بنی سچائی کی  
ضرورت تھی۔ یہ رحمت ترک لحن میں موجود تھی اس واسطے وہ اس کام میں تقریباً مکمل  
کامیاب ہوئے تھے۔ ترکوں کا انسانیت پر یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

ان کو علم تھا کہ جس خطہ زمین پر آپ کا نزول ہوا اور آپ کا پہلا قدم مبارک پڑا  
کہ جس ہوا کا پہلا سانس آپ کے اندر جذب ہوا اور جس نے آپ کی آواز کا گداز پہلی بار  
برداشت کیا کہ جس ہوا کی سہارے پہلے پرندے کی پکار آپ تک آئی اور پھر جس خلا کے خم  
سے چاند اور سورج نے پہلی بار آپ کو اور آپ نے پہلی بار ان کو دیکھا کہ جہاں جہاں آپ  
کی بینائی میں نئے ستاروں کا وقوع ہوا اور جس جس طور آپ کی وسیع ہوتی آنکھوں نے ان  
کی دوہری حرکت کو واحد کر کے اپنی لہو میں سمو یا کہ یہ قد آور لمحے، گوشے، چہرے اور ہوا اور  
بنیائی، صدا اور شنوائی کے نقش اول محض رسول اللہ ﷺ ہی کے نہیں، بلکہ آتی دنیا تک ہر نئے  
کلمہ گو کے لہو کا اول، ازلی، آبائی اور اصلی نشان ہیں۔ اس بات کا ان کو مکمل علم تھا، سو ان تمام  
چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے پنپ پا کر اس بڑے ہوتے ہوئے بچے میں بنو سعد

کی خصلت اور محبت سے آغاز کرنے کا ارادہ کیا مگر سب سے پہلے انہوں نے مدینہ منورہ میں اس میدان کا تعین کیا کہ جہاں مرنے سے پہلے ایک خوب رو اور کم عمر نوجوان نے اپنے گھر سے دور، بخاری گرمی اور بے چینی کو مٹانے کے واسطے، ایک شام، چند لمحات کے واسطے گشت کیا تھا اور پھر اپنی کم سن، خوبصورت اور بس مکھ بیوی کو بیوہ اور ابھی ماں کے بدن ہی میں قائم بچے کو یتیم اور بے سہارا چھوڑ کر اپنی تمنائیں اپنے دل ہی میں لیے مر گیا تھا۔

پھر انہوں نے ایک پہاڑ کی کوکھ میں اس چھوٹے سے گھر کا تعین بھی کیا کہ جس کی پہلی منزل پر شمال کی جانب قائم ایک چھوٹے سے بالکل چوکور کمرے میں کہ جہاں چہار آئینوں کو اوٹ میں چہار سمتیں ملتی تھیں، ایک بچہ کہ جس کو کائنات کی امان تھی، ظہور میں آیا تھا۔ پھر اس بچے کو ایک بزرگ انسان نے اپنے محنت اور سبورج کملائے ہاتھوں سے اپنی ایک چادر میں لپیٹا تھا اور وہ پگڈنڈی طے کی تھی کہ جو اللہ کے گھر تک جاتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس ضعیف انسان نے چادر میں لپیٹے ہوئے نوزائیدہ بچے کو ہاتھوں میں رکھ کر کائنات کی جانب بلند کیا تھا اور دعا کی تھی کہ اے خالق کائنات اس بچے پر رحم فرما، اس واسطے کہ یہ بے آسرا اور یتیم ہے۔ ترکوں نے اس شمالی کمرے، اس آبائی پگڈنڈی اور اس دعا کے مقام کا بھی نہایت ہی کاوش سے تعین کر کے خاموش ریگستان کی سنگم پر اس جگہ کو بھی دریافت کر کے محفوظ کیا تھا کہ جہاں اس دعا کے کوئی چھ برس بعد اپنے جواں مرگ خاوند کی قبر سے واپسی پر اپنے چھ برس کے حیران بچے کی انگلی پکڑے پکڑے جب اس کم سن خاتون نے ایک رات کے واسطے پڑاؤ کیا تھا تو وفات پائی تھی۔

اگلے روز حیران آنکھوں والے اس چھ برس کے بچے نے اپنی ماں کا چہرہ کہ جس سے اب آہستہ آہستہ وہ مانوس ہو رہا تھا، آخری بار دیکھا تھا اور پھر اپنی ماں کو اپنے کچے کچے ہاتھوں سے انجان خاک میں اتار کر قافلے کے ساتھ اپنی مقدر کی جانب چل پڑا تھا۔ ترکوں نے اپنی شمالی درگاہ، سہاگ، صفائی اور خوش اسلوبی سے ایک کتبہ یہاں بھی چھوڑ دیا تھا کہ

آنے والوں کا نام ہی ہو کہ معصوم ہوں کی اکیل ہی ہے کہ جوان ووحدت کا ہمارا بناتی ہے۔  
 ان کا اتنا قدم اس رات کا تعین کرنا تھا جس پر اس واقعے کے تین برس بعد یہ  
 بچہ ایک ضعیف میت کے ساتھ ساتھ چار پانی کا پیا پیزا کرسب کے سامنے بلک بلک کر روتا  
 ہوا چلا تھا۔ اس نو شاید احساس تھا کہ آج کے بعد اس کی اکیل کا ثنائی وحدت کی اکیل ہے  
 اور آج کے بعد شاید وہ کبھی کھل کر رونہ سکے گا۔ غرض یہ کہ ترکوں نے رسول پاک ﷺ کی  
 ولادت سے لے کر آپ کی وصال مبارک تک کے واقعات کو آنے والی نسلوں کے تاریخی،  
 جمالیاتی اور ایمانی شعور کے واسطے درستگی اور سادگی کی ساتھ محفوظ کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا،  
 اس میں وہ ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ آپ کے بچپن سے جوانی تک کی سمتوں کا  
 تعین کرنے کے بعد انہوں نے غار حرا کی چوٹی سے آسمانوں کو دیکھا اور پھر اس اونچے پہاڑ  
 کی نشیبی وادی میں قائم شہر کے ایک گھر کے اس چھوٹے سے کمرے کا تعین کیا کہ جہاں  
 حیرت پرے سے اپنے نام کی پکار سننے کے بعد واپس آ کر رسول پاک ﷺ نے آرام فرمایا  
 تھا اور جہاں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ پر اپنی مکمل اعتماد سے آپ کو اس حد  
 تک حوصلہ دیا تھا کہ جب فتح مکہ کے بعد آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں قیام کریں گے، تو  
 آپ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر کے ساتھ آپ کا خیمہ  
 نصب کیا جائے۔ بعض لوگوں کے استفسار پر کہ آخر ایک قبر کے کنارے ایک قبرستان میں  
 کیوں؟ آپ نے فرمایا تھا: ”جب میں غریب تھا، تو اس نے مجھ کو مالا مال کیا۔ جب انہوں  
 نے مجھ کو جھوٹا ٹھہرایا، تو صرف اس ہی نے مجھ پر اعتماد کیا اور جب سارا جہان میرے خلاف  
 تھا، تو صرف اس اکیلی ہی کی وفا میرے ساتھ تھی۔“

ترکوں کے ماہرین نے پہلے اس گھر کا پھر اس گھر میں اس کمرے کا تعین کیا کہ  
 جہاں مکمل اعتماد کا یہ بنیادی لمحہ گزرا تھا۔ یہاں یہ بیان کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ اس  
 کمرے اور اس کے بارے میں کہ جہاں آپ کا ظہور ہوا تھا، عثمانی حکومت کی جانب سے

جاری احکامات تھے، وہ کیا تھے؟ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر والے کمرے کے بارے میں جاری حکم تھا کہ ہر بار رمضان کا چاند دیکھتے ہی اس میں سفیدی کی جائے اور پھر فجر کی اذان تک خواتین باواز بلند قرآن کی تلاوت کریں، جبکہ حضرت عبدالمطلب سے اس میں واقع اس شمالی کمرے کے بارے میں احکامات یہ تھے کہ پہلی ربیع الاول کو کمرے سے اندر سفید رنگ کیا جائے، رنگ ساز حافظ قرآن ہوں اور پھر ربیع الاول کی اس رات و جب آپ کا ظہور ہوا، معصوم بچے اس کمرے کے اندر آئیں اور قرآن کی تلاوت کریں۔ انکی بیچ پرندے آزاد کرنے کا حکم اور رواج تھا۔

سو جہاں انہوں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان اور مقبرے کا تعین کیا، وہاں انہوں نے بنو ارقم کی بیٹھک کو محفوظ، ورقہ بن نوفل کی دہلیز کو پختہ اور حضرت ام بانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آنگن کی نشاندہی بھی کروائی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مکے اور مدینے میں قائم ان ازلی قبرستانوں کو کہ جن میں خانوادہ رسول کے بیشتر افراد، اصحاب کرام اور ان کے خاندان اور چیدہ ترین بزرگان دین قیامت کے منتظر سوتے تھے، صاف ستھر اور پاک کروایا اور پھر نہایت ہی سنجیدگی سے قبروں کی نشان دہی کر کے مکمل نقشے مرتب کروائے۔

ان تمام کاروائیوں میں ترکوں کا طریقہ کار بہت موثر اور یکتا ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر جب ترک حجاز پہنچے تو مسجد بلال جو کہ خانہ کعبہ کے سامنے ایک پہاڑ پر واقع ہے، صدیوں کی غفلت کی وجہ سے تقریباً مٹی اور پتھر کا ڈھر ہو چکی تھی۔ اس چھوٹی سی مسجد کو اس کے اصل خطوط پر دوبارہ تعمیر کرنے کے واسطے جو طریقہ اختیار کیا گیا، وہ یہ تھا۔ پہلے تمام مٹی اور چوڑے کو پیس کو نہایت باریک ٹھکنیوں سے چھان کر الگ الگ تیار کر لیا گیا۔ بجھے ہوئے چوڑے کا کیمیائی تجزیہ کر کے اس کے اجزاء معلوم کیے گئے۔ پھر ان اجزاء کے اسلی اور پانے ماخذ دریافت کرنے کے بعد ایک ہی ماخذ کی نئے اور پرانے چوڑے کو ملا کر اور مزید طاقتور بنا کر چٹائی کے واسطے استعمال کیا گیا۔ پتھر بھی اپنی ترش، کیفیت اور ساخت کو مد نظر



رکھتے ہوئے تقریباً اسی طرح اور اسی جگہ نصب ہوئے کہ جہاں پہلی مرتبہ عہد نبوی ﷺ کے فوراً بعد نصب ہوئے تھے۔

اس طرح وہی مٹی، وہی گار اور وہی چونا اور وہی پتھر بالکل اسی طرح استعمال ہوا جیسا کہ صدیوں پہلے مسجد کی تعمیر اول میں استعمال ہوا تھا۔ مسجد نئی بھی ہو گئی اور اپنے اصلی اور اول خطوط پر قائم بھی رہی۔ یہ ترکوں کے طریقہ کار کی محض ایک قدرے معمولی مثال ہے۔

جب ۵۳ برس مکے میں بیت گئے اور زمین کی گردش اس شہر کو ایک بار پھر وہیں لے آئی جہاں وہ ۵۳ سال گردشوں پہلے تھا۔ تو نئے ستاروں کا وقوع ہوا تھا اور رسول پاک ﷺ نے مدینے کا رخ کیا تھا۔ سوترک بھی اس آبائی راستے پر چل نکلے تھے۔ غار ثور کو انہوں نے کچھ نہ کہا اور یہی مناسب سمجھا کہ نہ تو اس کے جالے صاف کریں اور نہ ہی کبوتروں کے صدیوں پرانے گھونسلوں کے جھاڑ جھنکار کو کاٹیں یا ہٹائیں۔ غار ثور کو انہوں نے مکزیوں اور کبوتروں کے سپرد ہی رہنے دیا کہ اب جائز طور پر وہی اس گوشے کے مالک اور حقدار تھے۔ غار حرا تک کی نہایت ہی مشکل چڑھائی کو بھی انہوں نے آسان بنانے کی کوئی کوشش نہ کی تاکہ چڑھنے والوں کو چوٹی تک پہنچنے کے جتن کا احساس برابر ہوتا رہے۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ وہ تہائی چڑھائی پر ایک نہایت سادہ سی ناند بنا دی تاکہ بارش کا پانی کبھی کبھی جمع ہو سکے اور بچے، بوڑھے اور عورتیں اگر چاہیں، تو چڑھائی کے دوران پیاس بجھا سکیں۔

اس کے بعد انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر سے لے کر مدینے کے اطراف میں قائم بنو نجار کی کچی بستی تک ہجرت کے راستے کا حتمی تعین کر کے نقشہ مرتب کیا۔ ترک جب حجاز پہنچے تو بنو نجار تتر بتر ہو چکے تھے۔ پھر بھی ترکوں نے بچے کچے اونٹوں کو تلاش کیا اور سینہ بہ سینہ محفوظ، ان کی لوگ گیتوں کو پہلی بار قلم بند کر کے باقاعدہ محفوظ کیا۔ مسجد قبا کو نہایت ہی ہنر سے بحال کرنے کے بعد وہ کچھ دیر اس کنوئیں کی منڈیر پر بھی سنانے کو بیٹھے کہ جہاں ہجرت کے بعد پہلی نماز ادا کر کے رسول پاک ﷺ نے قیام فرمایا۔

تھا اور جس کو دیکھ کر آپ نے اونچے ہوتے پانی میں اپنے چہرے کا شفاف عکس دیکھ کر، پہلے ایک لمحہ توقف، اور پھر مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔

اس کنوئیں سے اب راستہ مدینے کو جاتا تھا۔ مدینے کے اس میدان تک جاتا تھا کہ جہاں آپ کی آمد سے کوئی ۵۳ برس پہلے، ایک شام، مرنے والے پہلے ایک خوب رو اور کم عمر نوجوان نے اپنے گھر سے دور اپنے بخار کی گرمی اور بی چینی کو مٹانے کے لیے چند لمحات کی واسطی گشت کیا تھا اور پھر اپنی کم سن، خوبصورت اور ہنس مکھ بیوی اور ابھی ماں کے بدن ہے میں قائم بچے کو یتیم اور بے سہارا چھوڑ کے اپنی تمنائیں اپنے دل ہے میں لیے فوت ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر وہی میدان تھا۔ مسجد نبوی کو اب یہاں تعمیر ہونا تھا۔ مسجد نبوی کی تعمیر بھی ایمان، ہنرمندی، پاکیزگی اور نفاست کی ایک عجیب انوکھی داستان ہے۔ پہلے پہل برسوں تک تو ترکوں کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسجد نبوی کو تعمیر کریں۔ ان کے نزدیک یہ ایک کائناتی اور انسانی حدود سے ماوراء طاقتوں کے بس کا عمل تھا اور وہ محض انسان تھے۔ مگر جب انسان سچی محبت کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے باہر قدم دھرنے کی ہمت بھی پا جاتا ہے۔ سو اپنی محبت کی سچائی کے سہاری انہوں نے یہ کام شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ ترکوں نے اپنی وسیع الطنفت اور پھر پورے عالم اسلام میں اپنے اس ارادے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس جتنی کام کے واسطے ان کو عمارت سازی اور اس سے متعلقہ علوم اور فنون کے ماہرین درکار ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ہندوستان، افغانستان، چین، وسطی ایشیا، ایران، عراق، شام، مصر، یونان، شمالی اور وسطی افریقہ کے اسلامی خطوں اور نہ جانے عالم اسلام کے کس کس کو نے اور کس کس چہرے سے نقشہ نویس، معمار، سنگ تراش، بنیادیں زمین کی زندہ رگوں تک اتارنے کے ماہر، چھتوں اور سائبانوں کو ہوا میں معلق رکھنے کے ہنرمند، خطاط، بچہ کار، شیشہ گر اور شیشہ ساز، کیمیا گر، رنگ ساز اور رنگ شناس، ماہرین فلکیات، ہواؤں کے رنج عمارتوں کی دھار کو ٹھانے کے ہنرمند اور نہ جانے کن کن عیاں اور کیسے کیسے پوشیدہ

علوم کے ماہرین، اساتذہ، پیشہ ور اور ہنرمندوں نے دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اپنے اہل و عیال کو سمیٹا اور اس ازلی بلا وے پر قسطنطنیہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ کہیں بے حد دور، ایک چٹیل ریگستان میں جنت کی کیاری کے کنارے، ان کے رسول کی قیام گاہ پر تعمیر ہونے لگی اور وہ اور ان کے ہنر اب ہر طرح اس کام کے واسطے وقف تھے۔

ترکوں کو اس والہانہ کیفیت کی ایک حد تک امید تھی، مگر پھر بھی کہا جاتا ہی کہ اس اجتماعی بے اختیاری اور مکمل اطاعت پر ان کو تعجب ضرور ہوا تھا۔ بہر کیف ان کی تیاریاں بھی مکمل تھیں۔ عثمانی حکومت کی تقریباً ہر شاخ، اعلان سے پہلے ہی حرکت میں آ چکی تھی اور حکومت کے اہل کار اپنے حدود میں اور سفیر دوسرے اسلامی ممالک میں اس انداز اور اس ارادے کے تمام لوگوں کی اعانت کے واسطے تیار تھے۔ ان اہلکاروں اور سفیروں کا یہ احکامات تھے کہ وہ ان تمام ماہرین اور ان کے ہمراہ ان کے اہل و عیال کو، اگر وہ چاہیں، تو قسطنطنیہ تک کے راستے میں ہر طرح کی سہولت فراہم کریں۔ ادھر سلطان وقت کے حکم سے قسطنطنیہ سے چند فرسنگ کے باہر میدانوں میں ایک خود کفیل اور کشادہ بستی تیار ہو چکی تھی۔ سو پھر جب ان یکتائے روزگار لوگوں کے قافلے پہنچنے شروع ہوئے، تو ان کو ان کے روزگار کے اعتبار سے اس نئی بستی کے الگ الگ محلوں میں بسایا جانے لگا اور حکومت مکمل طور پر ان کی کفیل ہوئی۔

اس عمل میں کوئی پندرہ برس گزر گئے، مگر اب یہ یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ اس بستی میں اپنے وقتوں کے عظیم ترین فنکار جمع ہو چکے ہیں۔ اب خود سلطان وقت اس نئی بستی میں گیا اور اس نے خاندانی سربراہوں کا اجلاس طلب کر کے منصوبے کا اگلا حصہ ان کے سامنے رکھا۔ منصوبے کا اگلا حصہ اس طرح تھا۔ ہر ہنرمند اپنے سب سے ہونہار بچے یا بچوں (اولاد نہ ہونے کی صورت میں ہونہار ترین شاگرد) کا انتخاب کرے اور اس بچے کے جوان ہونے یا پختہ عمر کو پہنچنے تک اس کی بدن اور لہجہ میں اپنا مکمل فن منتقل کر دے۔ ادھر حکومت کا دوسرا حصہ تھا

کہ وہ اس دوران اس انداز کے اتالیق مقرر کرے کہ وہ ہر بچے کو پہلے قرآن کریم پڑھائیں اور پھر قرآن حفظ کروائیں۔ ساتھ ساتھ سواری بھی سکھے۔ اس تمام تعلیم تربیت اور تیاری کے واسطے پچیس برس کا عرصہ مقرر کیا گیا۔ اس منصوبے پر ہر ایک نے لبیک کہا اور صبر، محنت اور حیرت کا یہ بالکل انوکھا عمل شروع ہوا۔

چنانچہ پچیس برس بیت گئے اور ان انوکھے ہنرمندوں کی ایک نئی اور خالص نسل نشوونما پر کرتیا ہو گئی۔ یہ تیس سے چالیس برس عمر کے مخصوص اور نیک اطوار نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تھی کہ جو محض اپنی اپنی آبائی اور خاندانی فنون ہی میں یکتا اور عنقا نہیں تھے، بلکہ اس جماعت کو ہر فرد حافظ قرآن اور فعال مسلمان ہونے کے علاوہ ایک صحت مند نوجوان اور اچھا شہوار بھی تھا بچپن کے لمحہ اول سے ان کو علم تھا کہ یہ وہ چیدہ لوگ ہیں کہ جن کو ایک روز کہیں بے حد دور، ایک چشیل ریگستان میں، جنت کی کیاری کے کنارے اپنے رسول کی قیام گاہ کے گرد ایک ایسی کائناتی عمارت تعمیر کرنی ہے کہ جو آسمان کی جانب اس زمین کا واحد نشان ہو۔

ترکوں کے اعلان اول سے لے کر اب تک کوئی تیس برس سے زیادہ بیت چکے تھے، اور مسجد نبوی کے معمار، جن کی تعداد کوئی پانچ سو کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے، تیار تھے۔ ایک طرف تو ہنرمندوں کی یہ جماعت تیار ہو رہی تھی اور دوسری طرف ترک حکومت کے اہل کار عمارت کے واسطے ساز و سامان اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ حکومت کے شعبہ کان کنی کے ماہرین نے خالص اور عمدہ رگ دریشے کے پتھر کی بالکل نئی کانیں دریافت کیں کہ جن سے صرف ایک بار پتھر حاصل کر کے ان کو ہمیشہ کے واسطے بند کر دیا گیا۔ ان کانوں کی جائے وقوع کو اس حد تک سینہ راز میں رکھا گیا کہ آج تک کسی کو علم نہیں ہے کہ مسجد نبوی میں استعمال ہونے والے پتھر کہاں سے آئے تھے۔ بالکل نئے اور ان چھوٹے جنگل دریافت کیے گئے اور ان کو کات کر ان کی کٹائی کہیں بس تک تھام کی آہ و ہوا میں آسمان تلے مومایا

گیا۔ رنگ حاصل کیے اور شیشہ گروں نے شیشہ بنانے کے واسطے حجاز ہی کی ریت استعمال کی۔ ہچہ کاری کے قلم ایران سے بن کر آئے، جب کہ خطامی کے واسطے نیزے دریائے جمنا اور دریائے نیل کے پانیوں کے کنارے اگائے گئے۔ غرض یہ کہ جب تک ان ہنرمندوں کی جماعت تیار ہوئی، ان ہی کے بزرگوں کی خاص طور پر تیار کردہ ٹولیوں نے عمارتی سامان بھی فراہم کر لیا۔ یہ سارا عمارتی سامان بمعہ ہنرمندوں کی جماعت کے، نہایت ہی احتیاط سے خشکی، پھر سمندر اور پھر خشکی کے راستے حجاز کی سرزمین تک پہنچا دیا گیا کہ جہاں مدینے سے چار فرسنگ دور ایک نئی بستی اس تمام سامان کو رکھنے اور ہنرمندوں کی تعمیر کے دوران رہنے سہنے کے واسطے پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تعمیر مدینے میں ہوئی تھی، تو پھر ساز و سامان مدینے ہے رکھا جاتا۔ آخر یہ چار فرسنگ (بارہ میل) دور کیوں؟ اس کی وجہ ترک یہ بتاتے ہیں کہ آخر ایک بڑی عمارت تیار ہوئی تھی کہ جس کے واسطے مختلف جسامت کے ہزاروں پتھر کاٹی جانے تھے، بڑے بڑے مچان ٹھوک ٹھاک کر تیار ہونے تھے، اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے ضروری عمارتی عمل ہونے تھے کہ جن میں شور کا بی حد امکان تھا، جبکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ عمارت کی تعمیر کے دوران مدینے میں ذرہ برابر بھی کوئی شور نہ ہو اور جس فضائی ہمارے رسول کی آنکھیں دیکھیں اور آواز سنی ہوئی تھی، وہ اپنی حیا، سکون اور وقار قائم رکھے۔

سو ہر ایسا کام کہ جس میں ذرا سا بھی شور کا امکان تھا، مدینے سے چار فرسنگ کے فاصلے پر ہوا اور پھر ہر چیز کو ضرورت کے مطابق مدینے لے آیا گیا۔ ایک ایک پتھر پہلے وہیں کاٹا گیا اور پھر مدینے لا کر نصب کیا گیا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ چٹائی کے دوران کسی پتھر کی کٹائی ذرا زیادہ ثابت ہوئی یا کوئی مچان یا جنٹلا چھوٹا یا بڑا پڑا، تو اس کو عجلت میں ٹھونک بجا کر وہیں رسول پاک کے سرہانے ٹھیک نہ کیا گیا، بلکہ چار فرسنگ دور کی بستی لے جا کر اور درست کر کے دوبارہ مدینے لایا گیا۔ یہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ اس دور میں ذرائع مواصلات

کیا تھے۔ بھاری بوجھ نہایت ست رفتاری اور صبر سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا اور انسانی نقل و حمل کے واسطے سب سے تیز رفتاری اور پھر سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا اور انسانی نقل و حمل کے واسطے سب سے تیز رفتار سواری گھوڑے کے علاوہ کوئی اور نہ تھی۔ جبکہ سارا عمارتی سامان اپنی خام شکل میں مدینے کے مضافات والی بستی میں پہنچ گیا اور پھر پانچ سو کیلگ بھگ ہنرمندوں کی جماعت نے بھی اسی بستی میں آن کر سکونت پالی، تو سب کچھ اب اس جماعت کے سپرد کر دیا گیا۔ اپنے فنون کے استعمال اور اپنی تخلیقی عمل میں یہ فنکار و ہنرمند بالکل آزاد تھے۔ صرف دو احکامات ان کو دیئے گئے۔ اول یہ کہ تعمیر کے لمحہ اول سے لے کر لمحہ تکمیل تک اس جماعت کو ہر ہنرمند اپنے کام کے دوران با وضو رہے اور دوم یہ کہ اس دوران وہ ہر لمحہ تلاوت قرآن جاری رکھے۔ سو با وضو حافظ قرآن ہنرمندوں کی یہ جماعت پورے پندرہ برس تک مسجد نبوی کی تعمیر میں مصروف رہی اور پھر ایک صبح آجی کہ مسجد نبوی کے خلائی نشان کی چوٹی سے فجر کی اذان نے، زمین سے نہایت ہی بھروسے اور ایمان سے اگی اس عمارت کے مکمل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب خلا محفوظ بھی تھا اور آزاد بھی۔

یہ عمارت کیسی ہے، کیا ہی، کہاں ہے اور کہاں لے جاتی ہے؟ اس کی بارے میں تو الگ کتاب لکھوں گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ عمارت اس جہان میں ہوتے ہوئے بھی اس جہان میں نہیں ہے۔ اپنے اپنے آپ میں قائم رہ کر اس عمارت کو تو دیکھو تو یہ کہیں اور ہے۔ اپنے آپ سے باہر قدم دھر کے اس کو دیکھو تو یہ کہیں اور، اور ہم کچھ اور ہیں۔ پھر، خلا، ہوا، آواز، لحن، نیت، ایمان اور نور نے مل کر صبر کی ایک نئی بنت کی ہے۔ متوازی اوقات اگر رنگ برنگ کے دھاگے ہیں تو ان کی بنت میں بے رنگہ کا دھاگا اس عمارت کا لور ہے جو کہ اس بنت کو محکم معنی ہی نہیں دیتا، بلکہ اوقات کا ایک دوسرے سے ایک جائز اور معنی رابطہ بن کر اوقات کو ایک مرکز بھی فراہم کرتا ہے اور اوقات کے اس مرکز



سے ہم کو اپنے رسول ﷺ کی آوازیوں آتی ہے کہ جیسے خلا محفوظ بھی ہو اور آزاد بھی، کہ جیسے آواز پرندہ بھی ہو اور لہو بھی کہ اندھیرے میدانوں میں کبھی نور کا شجر اگے تو کبھی نور کی وادیوں میں اندھیرا خود ایک شجر ہو کہ جیسے نور محض نور ہی نہ ہو، بلکہ نور کا منبع بھی ہو۔ سو جب ریاض الجنۃ میں اس خلا کے خم پر اپنے رسول ﷺ کے سرھانے بیٹھو، تو کشف ہوتا ہے کہ آخر محبت کے کیا معنی ہیں اور نیت کی کیا حدود۔ اور پھر وہ بے نام ہنرمند یاد آتے ہیں کہ جن کو اپنے ہنر سے اس واسطے محبت تھی کہ وہ ان کے رسول ﷺ کی قیام گاہ کی حیا، سکون اور حیرت کو قائم رکھتے ہوئے اس عمارت کو اس خلا کے خم پر تعمیر کیا تھا کہ آج اس عمارت میں محض ان کا ہنر ہی نہیں، بلکہ ان کے ہنر کا غیب بھی محفوظ ہے، اور پھر ترکوں کے واسطے دعا ہمارے پور پور سے بلند ہوتی ہے۔

پھر کئی صدیاں بیت گئیں۔

اندرونی سازشوں اور بیرونی نیتوں کے دباؤ کے تحت پرانی حکومتیں کمزور اور نئی حکومتیں اور طاقتیں ظہور میں آتی رہیں۔ پھر جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا، تو پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس جنگ میں عثمانی حکومت نے انگریز، فرانسیسی اور اطالوی طاقتوں کے خلاف جرمن قوم کا ساتھ دیا۔ ۱۹۱۸ء میں ترک جرمن محاذ کو شکست ہوئی اور فتح پانے والوں نے جہاں جرمنی کے ٹکڑے کر کی شکست کے ساتھ ساتھ اس کے اجتماعی وقار کو خاک میں ملایا، وہاں ترکمانی ناموس بھی خون کے ساتھ ساتھ بہہ کر خاک میں شامل ہو گیا اور عثمانی حکومت کی کشادہ عدو بھی فاتح ٹولے نے عثمانی سلطنت کے خطوں پر حکومت کرنے کے دو طریقے رائج کیے۔ پہلا طریقہ براہ راست حکومت تھا اور جہاں براہ راست حکومت ممکن نہ تھی۔ وہاں ایک خاص منصوبے کے تحت ایسے قبیلوں، سیاسی جماعتوں یا افراد کو سہارا یا طاقت دینا طے پایا تھا کہ جن کی وساطت سے محض دائرہ اثر ہی کو قائم نہ رکھا جاسکے، بلکہ ہو سکے، تو ملت اسلامیہ میں مزید انتشار اور کشیدگی بھی پھیلائی جاسکے۔

ترکوں کی جنگ عظیم میں شکست کے بعد جزیرہ نما عرب میں جن طاقتوں نے علاقائی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر کھلم کھلا ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیئے تھے، ان میں صوبہ نجد کے ایک پیشہ ور باغیوں کا سعود نامی قبیلہ بھی شامل تھا۔ جنگ عظیم کے دوران ہی یہ لوگ ایک خفیہ معاہدے کے تحت انگریزوں سے مل چکے تھے۔ اس معاہدے کی رو سے انگریز یہ چاہتا تھا کہ جنگ عظیم کے دوران یہ قبیلہ اپنی بغاوتوں، حملوں، جنگوں اور چھاپوں وغیرہ سے ترکوں کا اتنا تنگ کرے اور برسر پیکار رکھے کہ مشرق وسطیٰ میں انگریز حملہ آوروں کی طرف پوری طرح دھیان نہ دے سکیں۔ اس کے عوض انگریز نے عہد کیا تھا کہ اگر وہ جنگ جیت گیا تو وہ پہلے نجد اور پھر جزیرہ نمائے عرب پر اس نجدی قبیلے کا تسلط قائم کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔ مگر یہ انگریز کا عہد تھا جو کہ کم از کم دو طرفہ تو سرور ہوتا ہے۔ سو یہی عہد انہوں نے حجاز کے حسینی قبیلے سے بھی کیا ہوا تھا۔ بس جو چیز دونوں عہد ناموں میں مشترک تھی، وہ تھی ترکوں کی شکست اور جزیرہ نمائے عرب سے انخلاء۔

بہر کیف ترکوں کی ہار کے بعد فاتح طاقتوں (اور بعد میں امریکہ) کے ایماء اور امداد پر سعودیوں نے اپنے علاقائی حریفوں کو آخر کار شکست دے کر ۱۹۲۱ء میں صوبہ نجد پر اپنی عمل داری اور بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ عالمی جنگ کے اختتام، ہی ترکوں نے جان لیا کہ حجاز کا نظام حجاز کے سربراہ قبیلے کے سردار کے سپرد کرنے کے بعد وہ حجاز میں اپنی حکومت صرف فوجی طاقت کے ذریعے قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی حملے کی صورت میں خاک حجاز پر لہو بہانا لازم ہو جائے گا اور خدا نخواستہ مکے اور مدینے میں گولی چلانی لازمی ہو جائے گی۔ یہ کیفیت ترک لجن اور خصلت کے بالکل برعکس تھی۔ سو کچھ عرصہ سوچ بچار کے بعد حجاز کی ترک گورنر کا حکم ہوا تھا، اور ترکوں نے خانہ کعبہ کے گرد آخری طواف کر کے مسجد نبوی کی دلہیز کو آخری بار چوما تھا اور خاک حجاز سے ہمیشہ کے واسطے چلے گئے تھے۔ اب اہل نجد اور اہل حجاز دونوں جزیرہ نمائے عرب کے بادشاہت

کے خواہاں تھے اور دونوں کو انگریز کی حمایت حاصل تھی۔

اس سیاسی خلا کو سعودیوں نے پر کیا اور ۱۹۲۳ء میں مکے پر اور ۱۹۲۵ء میں مدینے اور جدے پر قبضہ جمانے کے بعد اس نجدی قبیلے کے سردار نے ۱۹۲۶ء میں نجد و حجاز کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ یہاں سے حجاز پر سعودیوں کی حکومت کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دور ابھی تک جاری ہے۔ آخر یہ سعودی کون ہیں؟

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے جزیرہ نمائے عرب کے ایک مشرقی صوبے نجد سے ان کا تعلق ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ رسول پاک ﷺ کی وقتوں میں جس قبیلے نے سب سے آخر میں اسلام قبول کیا تھا اور پھر آپ ﷺ کے وصال مبارک کے فوراً بعد ہی جو قبیلہ اسلام سے منحرف ہو گیا تھا، وہ یہی سعودیوں کا قبیلہ تھا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان ہی کی سرکوبی کے واسطے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کے ساتھ نجد کی طرف روانہ کیا تھا اور ایک جنگ میں شکست پانے کے بعد ان میں سے کچھ پھر سے اسلام لے آئے تھے۔ اس موقع پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس علاقے میں ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ اس مسجد کے آثار ایک کھنڈر کی صورت میں ابھی تک قائم ہیں۔ نسبیات کے جدید ماہرین کا کہنا ہے کہ سیلمہ بن کذاب کا تعلق بھی اسی قبیلے کی ایک مرکزی شاخ سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بیت ناک غلط ہو، مگر حجاز میں اقتدار سنبھالنے کے بعد جو بدسلوکی انہوں نے رسول پاک ﷺ کی ذات سے وابستہ تاریخی، جمالیاتی، روحانی، جسمانی اور معاشرتی نشانات کے ساتھ کی ہے۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ علم نسبیات کے ماہرین کا یہ کہنا غلط نہیں ہے۔

پھر اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ایک شخص محمد بن عبدالوہاب نے انہی میں سر اٹھایا تو ان کی بلا سوچے سمجھے کانٹے والی تلوار کو اس کی تقریب کی سہار لی اور اس کی تقریر کو جس پر بیمار دماغ کی بوجھ کر کوئی کان نہ دھرتا تھا، ان کی تلوار اور عمارتوں کی سہار سے ملاکت

حاصل ہوئی، حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے وسط تک محمد بن عبدالوہاب اور اس کے سعودی سرپرست کی اتنی ہمت ہوئی کہ ان دونوں نے مل کر عالم اسلام کے ہر بادشاہ اور فرماں روا کو خطوط بھیجے۔ ان خطوط میں اور باتوں کے بعد نیپ کے بند کے طور پر مندرجہ ذیل عبارت درج تھی:

اللہ ایک ہے اور محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں مگر محمد (ﷺ) کی

تعریف کرنا یا ان کی تعظیم کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔“ (نعوذ باللہ من ذالک)

آج تک سعودی لہو کی خصلت یہی ہے۔

سو حجاز پر قبضہ جانے کے فوراً بعد ہی جو سب سے پہلا کام سعودیوں نے کیا تھا،

وہ حجاز کے طول و عرض سے رسول پاک ﷺ کے نام کو محو کرنے کا تھا۔ مسجد نبوی، خانہ کعبہ کی

مسجد اور اس کے علاوہ جہاں جہاں اور جس جس عمارت اور مسجد پر محمد ﷺ کا نام نہایت ہی

فن اور محبت سے کندہ تھا، اس کو نہایت ہی بھونڈے پن سے مٹا دیا گیا۔ ایمان، محبت، فن

خطاطی اور دیگر فنون لطیفہ کے ان نادر نمونوں پر کہیں پھر کول پھیر دیا گیا اور ف کہیں ان پر

پلستر تھپ دیا گیا۔ اکثر اوقات لوہے کی چھینی اور ہتھوڑے کا استعمال بھی کیا گیا۔ اس بے

مثال گستاخی کے نشانات آج تک حجاز کے طول و عرض میں اور خاص طور پر کعبہ کی پرانی مسجد

اور مسجد نبوی ﷺ کے در و دیوار پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ رسول پاک ﷺ کا نام مٹانے کے بعد

سعودیوں نے ایک باقاعدہ نظام کے تحت حیات طیبہ سے منسلک تقریباً ہر تاریخی، جمالیاتی،

روحانی، جسمانی اور معاشرتی نشان کو اپنی ذوقنی قلت اور قلیل تر عقیدے کا ہدف بنایا۔ جنت

معلیٰ اور جنت البقیع کے قبرستان کہ جن کی بھر بھری خاک میں حضرت عبدالمطلب، حضرت

ابوطالب، ورقہ بن نوفل، حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عباس رضی اللہ

تعالیٰ عنہ، حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن، آپ

کی صاحبزادیاں رضی اللہ تعالیٰ عنہن، آپ کے صاحبزادگان اور خانوادہ رسول کے دیگر

اعضائے کرام اور ان کے پوتے پوتیاں، صحابہ کرام، ناموران

اسلام اور دو جہانوں کی چہار سمتوں سے محبت اور ایمان کی خاطر آئے ہوئے ان گنت گنام مسلمان سکون آور شائستگی سے سوتے تھے، لوہے کے مشینی بل چلا کر کھود ڈالے گئے اور پھر پیلا پھروا کر برابر کروادئے گئے۔ بعد میں جنت البقیع کے سامنے سڑک کے ساتھ قائم شہدائے کرام کے مزار سڑک کو چوڑا کروانے کی نذر ہوئے اور حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کے مزار اور تابوت کو ایک بازار کی توسیع کے دوران راتوں رات غائب کروادیا گیا۔ نہ ابو طالب کا محلہ رہا نہ ورقہ بن نوفل کی دہلیز، نہ ام ہانی کا آنگن رہا، اور نہ ہی بنو ارقم کی جگہ کرائے کی موٹر گاڑیوں کا اڈہ ہے اور رہا ام ہانی کا گھر کہ جس کے آنگن میں دو وقت مل کر ایک ہوئے تھے، تو وہ مسجد حرام کی ”توسیع“ کے دوران مٹ کر بے نشان ہو چکا ہے۔ جب حضرت عبدالمطلب کی قبر ہی نہ رہی، تو اس تک جاتا وہ راستہ بھی نہ رہا کہ جس پر نو برس کا ایک بچہ آخری بار کھل کر رویا تھا اور نہ ہی وہ پگڈنڈی رہی کہ جس پر ایک ضعیف انسان اپنی چادر میں ایک نوزائیدہ بھے کو لپیٹ کر لے چلا تھا۔ ہاں! اس بے وضع عمارت کے سائے میں جو ابو طالب کے محلے کو کھود کر بنائی گئی ہے۔ ایک گھر اور اس کا وہ شمالی کمرہ کہ جس میں چہار آئینوں کی اوٹ میں کبھی کبھار چہار سمتیں ملی تھیں، ابھی تک بمشکل موجود ہے۔ مگر اس کمرے میں عرصے سے سفیدی نہیں ہوئی ہے نہ ہی تیسرے چاند کے بارہویں دن معصوم بچے تلاوت کرنے اس گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کمرے کے شمال کی جانب ایک روشن دان ضرور موجود ہے، مگر اس سے اب شمال کا ستارہ نہیں دیکھ سکتے کہ متعدد منزلوں کی وہ بد وضع عمارت کہ جو شانید کہیں اور نہ بن سکتی تھی، راستے میں حائل ہے اور رہے پرندے تو ان کے آزاد کرنے کا رواج تو اس شہر میں کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔

اور ہاں اگر آپ اس گھر میں جس میں رحمۃ للعالمین ﷺ کا ظہور ہوا تھا، دو نقل

شکرانے کے نزدیک اس عظیم ترین رحمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا شرک ہے۔

یہاں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر اور اس کمرے کے بارے میں بھی

سن لیجیے کہ جہاں اعتماد کا ایک بنیادی لمحہ گزرا تھا۔ وہ کمرہ اور گھر بھی نصف صدی سے حافظ قرآن رنگ سازوں کا انتظار کرتے کرتے اب ایک صرافہ بازار سے گھر چکے ہیں۔

ہجرت کے راستے کا نشان تک مٹ چکا ہے۔ نئی حکومت نے مکے سے مدینے تک جانے کا نیا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ راستہ مکے سے مقام بدر تک سمندر کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اور وہی ہے کہ جس سے ابوسفیان، لشکر اسلام کی روانگی کی خبر سن کر اپنے قافلے کو بچا کر مکے کی جانب فرار ہو گیا تھا۔

مدینے پہنچتے ہی انسان مسجد قبا کا رخ کرتا ہے کہ جس کے سامنے والے احاطے میں وہ نہایت قدیم کنواں تھا کہ جس کے پانی نے آپ ﷺ کا رخ مبارک دیکھا تھا، مگر چند برس ہوئے اس کنوئیں کو بھی پتھر کی بڑی بڑی سلیں رکھ کر بند کیا جا چکا ہے۔ استفسار پر نہایت خشکی کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ مشینی پمپ ایجاد ہو چکے ہیں، اس واسطے اب اس کنوئیں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جب شکست و ریخت کا یہ وحشت ناک عمل شروع ہوا تھا، تو سر بارہ قبیلے کے سردار نے ترکوں کی بنائی ہوئی گنبد خضریٰ والی مسجد نبوی ﷺ کو گنبد خضریٰ سمیت منہدم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ پھر بہت بڑی بڑی اور اپنے وقتوں کی طاقتور ترین مشینیں منگوائی گئی تھیں اور پھر ایک نکل کے ستون سے شروعات کی گئی تھیں۔ دو ماہ تک یہ مشینیں اپنی پوری طاقت سے اس ایک ستون سے ٹکرائی گئیں اور اس کو گرانے یا توڑنے کی کوشش کرتی رہی تھیں، مگر یہ ستون ذرہ برابر بھی اپنی جگہ سینہ ہلاتھا۔ آخر اس کی جڑوں کو باوضو حافظ قرآن ہنرمندوں کے ایمان، عشق اور نیت کے سیسے نے تھاما ہوا تھا، یہ کیسے اپنی جگہ سے ہلتا۔ جب طاقتور ترین مشینوں کی دو ماہ تک مسلسل کوشش کے باوجود ایک ستون بھی اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہل سکا تھا، تو مسجد نبوی کو منہدم کرنے کی کوشش طوعاً و کرہاً روک دی گئی تھی۔ مسجد نبوی ﷺ کے اس ستون پر اس عمل کے نشانات آج تک موجود ہیں۔

سوال: کس کس دکھ کا بیان کروں؟ کسی نقشِ اولیٰ کو عقیدے کے قلب نے مٹایا، تو



کسی کو دل کی قلت نے، اور جو نقوش ان دونوں کی گرفت میں نہ آسکے، ان کو بے اعتنائی اور جمالیاتی حس کے فقدان نے۔ اگر کبھی برسراقتدار لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھو، تو اول تو اس پر صغیر کے محبت کے مارے مسلمانوں کو اس لائق ہی نہیں سمجھا جاتا کہ ان کو کوئی جواب دیا جائے۔ اگر کوئی مجبور کرے، تو پھر دو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یعنی ”توسیع“ اور ”شُرک“۔ کیا ”توسیع“ کسی اور انداز، حوصلے اور قرینے کے ساتھ نہ کی جاسکتی تھی کہ جس طرح ترکوں نے کی؟ اور کیا ”شُرک“ کو مٹانے کی طریقہ صرف یہی تھا کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باوقاہڈیوں کے نشان کو مٹا دیا جائے؟؟؟

## شُرک کی حقیقت

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ۔ (سورۃ النساء: ۳۶/۳۷)

شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رقم فرماتے ہیں۔ ”وبالجملة شرک سے قسم است در وجود در خالقیت و در عبادت (اشعۃ اللمعات جلد ۱ صفحہ ۷۲) خلاصہ مطلب یہ ہے کہ شرک تین طرح پر ہوتا ہے ایک تو یہ کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو واجب الوجود ٹھہرائے دوسرا یہ کہ کسی اور کو اس کے سوا ہقیقتاً خالق جانے یا کہے، تیسرا یہ کہ عبادت میں غیر خدا کی عبادت کرے یا اس کو مستحق عبادت سمجھے“ اسلام میں شرک کی صرف تین صورتیں ہیں۔ حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی گجراتی مثبت فرماتے ہیں۔ ۱۔ شرک فی الذات یعنی عالم کے مستقل خالق و مالک دو مانے جائیں جیسا کہ مجوسی خیر اور شرک دو مستقل خلق مانتے ہیں۔ ۲۔ شرک فی الصفات یعنی بعض بندوں کا خدا سے وہ رشتہ مانا جائے جو ہم جنسیت چاہتا ہے۔ جیسا بیٹا ہونا، زوجہ ہونا، بھائی، بھتیجا، بھانجا وغیرہ ہونا اور مشرکین عرب فرشتوں و ستاروں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ ۳۔ شرک فی الافعال یعنی کہ اللہ کے بعض بندوں کو رب تعالیٰ کا معاون و مددگار مانا جائے کہ رب تعالیٰ ان کے بغیر کام چلا سکتا ہی نہیں جیسا کہ بعض مشرکین عرب اپنے بتوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے۔

(تفسیر نعیمی ملخصاً، پ ۵: ص ۱۳۹)

درج بالا بحث کی روشنی میں غور کیجئے کہ آج تک کسی مسلمان نے کسی ولی، غوث، قطب یا نبی و رسول کے متعلق خواہ جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس ہی ہو، ایسا اعتقاد رکھا ہے؟ اگر نہیں اور مانا نہیں تو پھر وہ صاحبان جو مسلمانوں کو شرک ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے ہیں اور وہ تمام آیات جو مشرکین مکہ اور کفار عرب کے حق میں نازل ہوئیں، مسلمانوں کے حوالے کر کے دیکھتے ہیں جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

خارجیوں اور ملحدوں کی متعلق فرماتے تھے ”ہو شرار خلق اللہ و قال انہم انطلقوا انی ایات نذلت فی الکفار فجعلوها علی المؤمنین“۔ (بخاری، ۱۰۲۲/۲)

ترجمہ: وہ اللہ کی بدترین مخلوق ہیں نیز فرمایا کہ یہ لوگ ان آیات کو جو کفار کے حق میں نازل ہوئی ہیں، مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔ لہذا خاکسار ایسے مسلمان نما دین فروش جو درحقیقت خارجیوں اور ملحدوں کی ترجمانی کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں کہ خدمت میں عرض کرتا ہے کہ کیا انہیں خدا کا خوف نہیں ہے؟ وہ ڈریں کہ کہیں ان کا شمال سحر فون الکم عن مواضع کے زمرہ میں نہ ہو جبکہ سید المرسلین، غم خوار امت ﷺ اپنی گنہگار امت کے متعلق واشگاف میں فرماتے ہیں ”اللہ کی قسم میں اپنے بعد تم پر یہ خوف نہیں کرتا کہ تم شرک کرنے لگ جاؤ گے“ اصل حدیث ملاحظہ فرمائیں: ”عن عقبہ بن عامر ان النبی ﷺ خرج یوماً فصلی علی اهل احد صلوتہ علی المیت ثم انصرف الی المنیر فقال انی فرط لکم و انا شهید علیکم و انی واللہ لا نظر الی حوضی الان و انی اعطیت مفاتیح خزائن الارض او مفاتیح الارص و انی واللہ ما اخاف علیکم ان تشر کو ابعدی ولكن اخاف علیکم ان تنافسو فیہا“

(بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۷۹، ۵۰۸، بخاری جلد ۲ صفحہ ۵۷۸، جلد ۲ صفحہ ۵۸۵، جلد ۲ صفحہ ۹۵۱، جلد ۲ صفحہ ۹۷۵، مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۵۰، مشکوٰۃ صفحہ ۵۳۷، فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۲۶۹، جلد ۶ صفحہ ۷۵۸، جلد ۷ صفحہ ۲۲۲، ۲۸۰، جلد ۲۳ صفحہ ۳۹، ۴۰، جلد ۲۳ صفحہ ۱۲۳، ارشاد الساری جلد ۲ صفحہ ۲۲۰، جلد ۶ صفحہ ۵۲، ۳۱۲، ۳۹۱، جلد ۹ صفحہ ۳۲۲، ۳۲۳، ۲۲۵: الکاشف شرح الطیبی جلد ۱۱ صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸، جلد ۲ صفحہ ۶۰۵)

**ترجمہ:** حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک دن (مدینہ سے) باہر نکلے اور شہداء احد پر نماز پڑھی، جس طرح اموات پر نماز پڑھی جاتی ہے، پھر منبر کی طرف جلوہ فرما ہوئے اور فرمایا میں تمہارا پیش رو ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں اور میں اللہ کی قسم

اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں یا زمین کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں اور اللہ کی قسم میں اپنے بعد تم پر یہ خوف نہیں کرتا کہ تم شرک کرنے لگو گے لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ تم دنیا میں رغبت کرنے لگو گے۔

قارئین کرام! حضور ﷺ نے اس حدیث میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ مجھے اس بات کا خوف نہیں ہے کہ میری امت شرک میں مبتلا ہو جائے گی جس سے واضح ہوا کہ جو مولوی صاحبان خواہ مخواہ مسلمانوں پر آئے دن شرک کے فتوے جڑتے رہتے ہیں اور یہ الاپتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں میں شرک بہت پھیل گیا ہے اور اصل توحید نایاب ہو گئی ہے وہ بظاہر تو میری اور آپ کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں مگر دراصل یہ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کی اس پیشین گوئی کو سچا نہ سمجھ کر درحقیقت دشمنی اور بدعتیہ کی کا ثبوت دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں انہیں صحیح العقیدہ سنی مسلمان نظر آتا ہے تو وہ اسے شرک کہنے سے باز نہیں آتے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی ایک حدیث نبوی کی شرح فرماتے ہوئے بیان کی ہے کہ ایک مسلمان کے متعلق یہ باور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خدا کا شریک ٹھہرائے اور ہاں، جہاں کہیں مسلمانوں کو شرک سے روکا گیا ہے، وہاں اس سے مراد شرک خفی ہے یعنی عبادت میں ریاء کاری اور دکھلاوا۔

معلوم ہوا کہ مسلمان ہونا ہی شرک کرنے یا شریک ٹھہرانے کے منافی ہے، جس کی تائید و توثیق جناب رسول کریم ﷺ اور امت محمدیہ کے نامور شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جسے تم میں سے کسی کا دل سے جو قرآن پڑھے گا جب اس پر قرآن کی رونق آجائے گی اور اس کا دل سے اللہ جہر چاہے گا، بہکا دے گا، وہ اسلام کی چادر

سے صاف نکل جائے گا اور اسے پس پشت ڈال دے گا اور اپنے پڑوسی پر تلوار چلانا شروع کر دے گا اور اسے شرک سے متہم و منسوب کر دے گا۔ (یعنی شرک کا فتویٰ لگائے گا)، (حضرت حدیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) میں نے پوچھا، اے اللہ کے نبی ﷺ! شرک کا زیادہ حق دار کون ہے؟ شرک کی تہمت لگایا ہو یا شرک کی تہمت لگانے والا؟ آپ ﷺ نے فرمایا شرک کی تہمت لگانے والا شرک کا زیادہ حق دار ہے۔ (یہ سند جید ہے) آخر میں دعا ہے کہ اللہ کریم ہمیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔





